ماہنامہ
اشراق
لاہور
نومبر ۲۰۲۴ء

1979
سے جاری شدہ
اشاعت کے
46 سال

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

”شریعت کے تمام احکام کا مدار اُن کے معنی پر ہے۔ قرآن نے یہ حقیقت اپنے اوامر و نواہی کے اطلاقات سے ہر جگہ واضح کر دی ہے۔ ائمۂ اصول اِس کو ’علت‘ سے تعبیر کرتے ہیں، لہٰذا قاعدہ ہے کہ ... حکم کی علت موجود ہے تو حکم بھی موجود ہے اور علت تبدیل ہو گئی ہے تو حکم بھی اُس کے لحاظ سے تبدیل ہو جائے گا۔ یہ علت حکم کی بنیاد ہے۔ اِس کو اِسی بنا پر ’مناط‘ کہا جاتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ زیادہ تر استنباط کے ذریعے سے متعین کی جاتی ہے، مگر قرآن کے اوامر و نواہی میں جہاں اِس کا امکان تھا کہ حالات کی تبدیلی کسی وقت کوئی تقاضا پیدا کر سکتی ہے، اُسے قرآن نے استنباط کے لیے نہیں چھوڑا، بلکہ اِس طرح کے موقعوں پر حکم کی علت پوری صراحت کے ساتھ خود بیان کر دی ہے۔“

—— شذرات

- خدا کی صفات کا یہ پہلو... سامنے رہنا چاہیے کہ وہ اگر توبہ کرنے والوں کی توبہ آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے تو مخالفت کرنے والوں کے لیے اُس کے عذاب اور اُس کی قدرت کی شانیں بھی اِسی طرح ظاہر ہو جایا کرتی ہیں۔ (قرآنیات)
- رحمت و نقمت، دونوں اُس (اللہ) کے اختیار میں ہیں۔ چنانچہ برق و رعد بھی وہی دکھاتا ہے اور آسمان سے بارش بھی وہی نازل کرتا ہے جس سے رزق و فضل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ (قرآنیات)
- حقیقت تک پہنچنے کے تین طریقے اختیار کیے گئے: عقل کے ذریعے سے، سیر باطن یا نفسی مشاہدات کے ذریعے سے، اور الہامی مذہب کے ذریعے سے۔ (یسئلون)
- انسان کے اندر انفاق کا جذبہ ہو تو پھر وہ دس روپے میں سے بھی انفاق کرتا ہے اور نہ ہو تو کروڑوں میں سے بھی نہیں کرتا۔ یعنی اصل میں یہ انسان کا رویہ ہے۔ (یسئلون)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

جلد ۳۶ شمارہ ۱۱ نومبر ۲۰۲۴ء جمادی الاول ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات

شریعت میں تبدیلی	جاوید احمد غامدی	۴

قرآنیات

البیان: المومن ۴۰: ۱-۲۲ (۱)	جاوید احمد غامدی	۸

معارف نبوی

علامات قیامت (۹)	جاوید احمد غامدی / ڈاکٹر محمد عامر گزدر	۱۶

مقالات

میزان: توضیحی مطالعہ: اصول و مبادی (۱)	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۲۹

سیر و سوانح

مہاجرین حبشہ (۳۶)	محمد وسیم اختر مفتی	۴۷

نقطۂ نظر

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حدیث کذبات ثلاثہ کی تحقیق	ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۵۶

یسئلون

اسلام کی افضلیت	شاہد رضا	۶۹
مومن کی امیدوں کا محور	معاذ بن نور	۷۲

شخصیات

حیات امین احسن (۱۴)	محمد بلال	۷۶

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد | محمد رفیع مفتی
طالب محسن | محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن | ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم | آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر | خورشید احمد ندیم
اظہار احمد | کوکب شہزاد
جنید حسن | مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

جاوید احمد غامدی

شریعت میں تبدیلی

اسلامی شریعت اللہ کا قانون ہے، جو اُس نے اپنے بندوں کو راہِ راست پر رکھنے کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اِس قانون سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اِس میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اِس کے نازل کرنے والے کی طرف سے تبدیلی ہو جاتی ہے۔ قرآن سے پہلے یہ قانون تورات میں بیان ہوا ہے۔ اِسی طرح شخصی معاملات میں دین ابراہیمی کی روایت کی حیثیت سے عرب میں بھی رائج تھا۔ قرآن نازل ہوا تو اِس کے بعض احکام اور بعض رسوم و ظواہر میں اُس نے تبدیلی کر دی۔ چنانچہ اِس پر لوگوں کو تعجب ہوا اور اُنھوں نے اعتراضات کرنا شروع کر دیے۔ قرآن نے اِس کے جواب میں فرمایا:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا، اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (البقرہ ۲:۱۰۶)

”ہم (تورات کی) جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا اُسے بھلا دیتے ہیں، (قرآن میں) اُس کی جگہ اُس سے بہتر یا اُس جیسی کوئی دوسری لے آتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟“

یہ تبدیلی کیوں ہوتی ہے؟ قرآن سے اِس کی مثالوں کا استقصا کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اِس کے وجوہ بالعموم دو ہی رہے ہیں:

ایک، افراد میں تبدیلی؛ جیسے خدا نے کوئی حکم اپنے کسی پیغمبر کو خاص اُسی کے لیے یا اُس کے صحابہ اور متعلقین کے لیے دیا تھا اور اب وہ دنیا میں نہیں رہے۔ اِسی طرح کسی قوم کو اُس کے کسی منصب کی رعایت سے دیا تھا اور

اب وہ اُس منصب پر فائز نہیں رہی یا حاملین شریعت کی حیثیت سے ایک قوم کی جگہ کسی دوسری قوم کا انتخاب ہوا تو جن چیزوں سے وہ مانوس تھے، اُن کے لحاظ سے اُن کے لیے بعض رسوم و ظواہر بھی الگ مقرر کر دیے گئے۔

دوسرے، حالات میں تبدیلی؛ جیسے زمین کی کھیتی اور پالتو جانوروں کے درمیان زندگی بسر کرنے والوں نے صنعت و حرفت اور تجارت اختیار کر لی اور بڑے شہروں میں آ کر آباد ہو گئے تو قربانی کے حکم پر عمل کرنا اُن کے لیے پہلے کی طرح ممکن نہیں رہا یا غیر معتاد مشقت کا باعث بن گیا۔ اِسی طرح تادیب و تنبیہ اور تربیت کے لیے کوئی حکم دیا گیا تھا اور اب اُس کی ضرورت نہیں رہی۔

یہ دونوں وجوہ ہر لحاظ سے قابل فہم ہیں اور علم و عقل کا تقاضا ہے کہ اِن کے پیش نظر قانون میں تبدیلی لازماً ہونی چاہیے۔ لیکن قانون اگر خدا کی طرف سے نازل کیا گیا تھا تو اُس کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے کہ خدا تو ماضی، حال اور مستقبل کی ہر چیز کا علم رکھتا ہے، پھر اُس نے جب پہلی مرتبہ قانون دیا تو اُس کے ساتھ اُسی وقت صراحت کیوں نہیں کر دی کہ یہ قانون فلاں اور فلاں تغیرات کے نتیجے میں ختم ہو جائے گا، یا متغیر ہو کر فلاں صورت اختیار کر لے گا؟ یہ طریقہ اگر اختیار کر لیا جاتا تو کسی اعتراض کی گنجایش پیدا نہیں ہو سکتی تھی، مگر ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، جس کے نتیجے میں شرائع اب بعض معاملات میں ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہو گئی ہیں۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اِس فیصلے کی حکمت بیان کی اور فرمایا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً، وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ، فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ، اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا، فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ. (۵: ۴۸)

”تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت، یعنی ایک لائحۂ عمل مقرر کیا ہے۔ اللہ چاہتا تو تمھیں ایک ہی امت بنا دیتا، مگر اُس نے یہ نہیں کیا، اِس لیے کہ جو کچھ اُس نے تمھیں عطا فرمایا ہے، اُس میں تمھاری آزمایش کرے۔ سو بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم سب کو (ایک دن) اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے۔ پھر وہ تمھیں بتا دے گا سب چیزیں، جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔“

مدعا یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے، اپنے قانون ابتلا کے مطابق کیا ہے تاکہ دیکھیں کہ لوگ رسوم و ظواہر

کے تعصب میں گرفتار ہو کر اصل حقیقت سے منہ موڑتے ہیں یا حقیقت کے سچے طالب بن کر اُس کو ہر اُس صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، جس میں وہ خدا اور اُس کے رسول کی طرف سے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح تم لکیر کے فقیر اور رسوم و ظواہر کے غلام بن کر نہ رہ جاؤ، بلکہ دین کی اصل حقیقت کو سامنے رکھو اور اللہ کے پیغمبر نے نیکی، خیر اور حصول قرب الٰہی کے لیے جد و جہد کی جو راہ تمھارے لیے کھول دی ہے، اُس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اللہ کی شریعت جس صورت میں بھی آئے، تمھارے لیے زیبا یہی ہے کہ اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو اور شرائع میں اختلاف کو بنیاد بنا کر دین کی اصل حقیقت، یعنی خدا کی بندگی سے روگردانی نہ کرو۔

اِس کے بعد یہ سوال، البتہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حالات کی تبدیلی سے شرائع اگر تبدیل ہوتی رہی ہیں تو انسانی تمدن اور اُس کے احوال میں جو تبدیلیاں سائنس کی غیر معمولی ترقی کے نتیجے میں مستقبل قریب یا بعید میں متوقع ہو سکتی ہیں، اُن میں پھر کیا کیا جائے گا؟ اِس لیے کہ اِس سے پہلے تو نبوت جاری تھی اور اللہ کے پیغمبر حالات کے لحاظ سے نئی شریعت لے کر آ سکتے تھے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ چنانچہ اِس طرح کی کوئی صورت حال اگر پیدا ہو جاتی ہے تو اُس کا کیا حکم ہے؟

اِس کے جواب میں عرض ہے کہ شریعت کے تمام احکام کا مدار اُن کے معنی پر ہے۔ قرآن نے یہ حقیقت اپنے اوامر و نواہی کے اطلاقات سے ہر جگہ واضح کر دی ہے۔ ائمۂ اصول اِس کو 'علت' سے تعبیر کرتے ہیں، لہٰذا قاعدہ ہے کہ 'إن الحكم يدور مع العلة وجودًا وعدمًا'، یعنی حکم کی علت موجود ہے تو حکم بھی موجود ہے اور علت تبدیل ہو گئی ہے تو حکم بھی اُس کے لحاظ سے تبدیل ہو جائے گا۔ یہ علت حکم کی بنیاد ہے۔ اِس کو اِسی بنا پر 'مناط' کہا جاتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ زیادہ تر استنباط کے ذریعے سے متعین کی جاتی ہے، مگر قرآن کے اوامر و نواہی میں جہاں اِس کا امکان تھا کہ حالات کی تبدیلی کسی وقت کوئی تقاضا پیدا کر سکتی ہے، اُسے قرآن نے استنباط کے لیے نہیں چھوڑا، بلکہ اِس طرح کے موقعوں پر حکم کی علت پوری صراحت کے ساتھ خود بیان کر دی ہے۔ چنانچہ دیکھیے، سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۸۲ میں لین دین سے متعلق تحریر و شہادت کا ایک خاص ضابطہ بیان فرمایا ہے تو اُس کے ساتھ ہی بتا دیا ہے کہ یہ 'اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ' ہے۔ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۳۴ میں شوہر کو بیوی پر قوام قرار دے کر اُس کے حقوق و اختیارات بیان کیے ہیں تو ساتھ ہی وضاحت کر دی ہے کہ

’بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ‘۔اِسی طرح آیات ۱۱-۱۲ میں میراث کے حصے متعین فرمائے ہیں تو ساتھ ہی متنبہ کر دیا ہے کہ اِن میں علت حکم ’اَقْرَبُ نَفْعًا‘ ہے۔

اِس سے واضح ہے کہ قرآن جس شریعت کو لے کر نازل ہوا ہے، اُس کے اوامر و نواہی کو اُس نے ’الأحکام بالعلل‘ کے اصول پر ہر زمانے اور ہر دور کے ساتھ اِس طرح متعلق کر دیا ہے کہ اُس کو کسی نئے الہام کی ضرورت کبھی لاحق نہیں ہو سکتی۔ خدا کی یہ کتاب اب خدا کا آخری عہد نامہ ہے، جو ابدی شریعت کے ساتھ نازل کر دیا گیا ہے۔ خدا کے بندوں پر اِس کی حکومت اُس دن قائم ہو گئی تھی، جس دن خدا کے مقرب ترین فرشتے جبریل امین نے اِس کو قلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا تھا، اور خدا کا فیصلہ ہے کہ زمین پر انسان کے آخری دن تک یہ حکومت اِسی طرح قائم رہے گی:

حرف او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المؤمن

(۱)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ۙ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنۡۢبِ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ ’حٰمٓ‘[۸۴] ہے۔ اِس کتاب کی تنزیل[۸۵] اللہ کی طرف سے ہے، جو زبردست ہے،[۸۶]

۸۴۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔ یہی نام اِس سے آگے تمام مکی سورتوں کا بھی ہے اور یہ اُن کے اسلوب، مضامین اور مزاج میں فی الجملہ اشتراک پر دلالت کرتا ہے۔

۸۵۔ لفظ ’تَنۡزِيۡل‘ اہتمام پر دلالت کے لیے ہے اور اِس میں یہ اشارہ ہے کہ جس نے یہ اہتمام فرمایا ہے، لوگ اُس کے شکر گزار ہوں اور اُس نے جو کتاب نازل کی ہے، اُس کی قدر کریں اور اُس سے ہدایت حاصل کریں۔

۸۶۔ یعنی اگر قدر کرنے اور ہدایت حاصل کرنے کے بجائے آمادۂ مخالفت ہوں گے تو وہ زبردست ہے اور مخالفت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت، دونوں میں سزا دے سکتا ہے۔

وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾
مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي
الْبِلَادِ ﴿۴﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ

سب کچھ جاننے والا ہے،[۸۷] گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے،[۸۸] سخت سزا دینے والا اور بڑی قدرت والا ہے۔[۸۹] اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، (بالآخر) اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔[۹۰] ۱-۳

اللہ کی آیتوں میں[۹۱] وہی لوگ جھگڑے نکالتے ہیں جو (اُس کی پکڑ کے) منکر ہیں۔ سو اِس ملک میں اِن کی چلت پھرت تم کو کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔[۹۲] اِن سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور

۸۷۔ چنانچہ یہ بھی جانتا ہے کہ اِس کتاب کی تنزیل سے جو کشمکش برپا ہوئی ہے، اُس میں کون کیا کر رہا ہے۔

۸۸۔ یہ ترغیب کے لیے فرمایا ہے کہ جو لوگ اب تک سرکشی کرتے رہے ہیں، وہ بھی اگر اپنی روش سے باز آجائیں تو خدا کا دامن رحمت وسیع ہے، وہ اُس میں جگہ پا سکتے ہیں۔

۸۹۔ اصل میں 'ذِي الطَّوْلِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'طَوْل' کا لفظ کئی معنی کے لیے آتا ہے۔ یہاں تقابل کے اصول کو پیش نظر رکھ کر قدرت کے معنی کو ترجیح دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی صفات کا یہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے کہ وہ اگر توبہ کرنے والوں کی توبہ آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے تو مخالفت کرنے والوں کے لیے اُس کے عذاب اور اُس کی قدرت کی شانیں بھی اِسی طرح ظاہر ہو جایا کرتی ہیں۔

۹۰۔ یعنی اُس کے سوا نہ کوئی سہارا دے سکتا ہے اور نہ اُس سے بھاگ کر کہیں جانے کی کوئی جگہ ہے۔ بالآخر لوٹنا اُسی کی طرف ہوگا اور اُس کے اذن کے بغیر کوئی بھی کسی کے کام نہ آسکے گا۔

سورہ کی یہ تمہید، اگر غور کیجیے تو مخاطبین کے لیے اظہار امتنان بھی ہے اور اُن کو تنبیہ بھی۔ اِس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا حوالہ اِن دونوں ہی پہلوؤں سے دیا گیا ہے۔

۹۱۔ اُسی کتاب کی آیتیں مراد ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

۹۲۔ یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اِس میں عتاب کا رخ، اگر غور کیجیے تو قریش کے

اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ قف
فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۵﴾ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ
اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۶﴾

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ
وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً

اُن کے بعد کے گروہوں نے بھی۔ ہر قوم نے اپنے رسول پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا اور باطل کے ہتھیاروں سے جھگڑے کہ اِس سے حق کو پسپا کر دیں تو میں نے اُن کو پکڑ لیا۔[۹۳] پھر کیسی تھی میری سزا![۹۴] تیرے پروردگار کی بات[۹۵] اِن منکروں پر بھی اِسی طرح پوری ہو چکی ہے کہ یہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ ۴-۶

(خدا کے فرشتوں کو اُس کے شریک ٹھیرا کر یہ اُن سے اپنے لیے سفارش کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ) عرش الٰہی کے حاملین اور جو اُس کے اردگرد ہیں، وہ تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اُس پر ایمان رکھتے ہیں[۹۶] اور ایمان والوں کے لیے مغفرت کی

اُنھی مستکبرین کی طرف ہے جو اپنی سیادت و امارت کے غرور میں آپ کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے اور قرآن جب اُنھیں عذاب کی وعید سناتا تھا تو اُس کا مذاق اڑاتے تھے۔

۹۳۔ چنانچہ تمھارے یہ منکرین بھی اِس کی جسارت کریں گے تو اِسی طرح پکڑے جائیں گے۔

۹۴۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'عِقَابِ' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ اِس طرح کے متمردین پر اللہ جو عذاب بھیجتا ہے، وہ درحقیقت اُن کے اعمال کا قدرتی ردعمل ہوتا ہے، اُس میں اُن پر کوئی زیادتی نہیں کی جاتی۔

۹۵۔ یعنی وہ بات جو روز ازل کہہ دی گئی تھی کہ جو لوگ اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر شیطان کی پیروی کریں گے، اللہ اُن سب کو جہنم میں بھر دے گا۔

۹۶۔ یعنی اُسی طرح ایمان رکھتے ہیں، جس طرح خدا کے بندوں کو رکھنا چاہیے۔ وہ الوہیت کے کسی زعم میں

وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۷﴾
رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ
وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۸﴾ۙ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ
وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۹﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ

دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اِس لیے جو توبہ کریں اور تیرے راستے کی پیروی کریں، تو اُن کی مغفرت فرما اور اُنھیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔[۹۷] اے ہمارے رب، اور تو اُن کو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں داخل کر، جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا تھا اور اُن کو بھی جو اُن کے باپ دادوں اور اُن کی بیویوں اور اُن کی اولاد میں سے صالح ہوں۔ بے شک، تو ہی زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[۹۸] اور اُن کو، (اے پروردگار)، برے اعمال کے نتائج سے بچا۔[۹۹] حقیقت یہ ہے کہ اُس دن جن کو تو نے برے اعمال کے نتائج سے بچا لیا تو وہی ہیں جن پر تو نے رحم فرمایا۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۷-۹

(یہ سفارش کی امید لگائے بیٹھے ہیں)؟ اِن منکروں کو تو وہاں منادی کی جائے گی کہ اِس وقت جتنی بے زاری تم کو اپنے آپ پر ہے، خدا کی بے زاری تم سے اُس وقت اِس سے کہیں زیادہ رہی

مبتلا نہیں ہیں۔

۹۷۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتے دعا اور سفارش تو یقیناً کرتے ہیں، لیکن اُنھی کے لیے کرتے ہیں جو ایمان کے ساتھ صحیح راستے پر گام زن ہوں۔ وہ خدا کے شریک ٹھیرانے والوں کی سفارش نہیں کرتے۔

۹۸۔ یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو زبردست ہے، اِس لیے جو چاہے، کر سکتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ حکیم بھی ہے، چنانچہ وہی کرے گا جو عدل و حکمت کا تقاضا ہو گا۔

۹۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ'۔ لفظ 'سَيِّاٰت' یہاں نتائج سیئات کے معنی میں ہے۔ یہ اُس قاعدے کے مطابق ہے کہ عمل اور نتیجۂ عمل کے لزوم کو بیان کرنے کے لیے فعل نتیجۂ فعل کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔

اِذۡ تُدۡعَوۡنَ اِلَی الۡاِیۡمَانِ فَتَکۡفُرُوۡنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا
اثۡنَتَیۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَہَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِکُمۡ بِاَنَّہٗۤ اِذَا
دُعِیَ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ کَفَرۡتُمۡ ۚ وَ اِنۡ یُّشۡرَکۡ بِہٖ تُؤۡمِنُوۡا ؕ فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ ﴿۱۲﴾
ہُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُنَزِّلُ لَکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا ؕ وَ مَا یَتَذَکَّرُ
اِلَّا مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿۱۳﴾ فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

ہے، جب تمھیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم (رعونت کے ساتھ) انکار کر دیتے تھے۔ یہ کہیں گے: اے ہمارے رب، تو نے ہم کو دو بار موت اور دو بار زندگی دی،[100] سو (مر کر جی اٹھنے کے بارے میں تو اب کوئی شبہ نہیں رہا، چنانچہ) ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا تو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ جواب دیا جائے گا: تم اِس انجام کو اِس لیے پہنچے کہ جب اکیلے خدا کو پکارا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور اگر اُس کے شریک ٹھیرائے جائیں تو تم مان لیتے تھے۔ سو اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر ہی کے اختیار میں ہے۔[101] ۱۰-۱۲

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے۔[102] (اِس سے) یاددہانی، البتہ وہی حاصل کرتے ہیں جو رجوع کرنے والے ہیں۔[103] سو، (رجوع کرنے والو)، تم اللہ کو پکارو، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کر کے، خواہ اِن منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

۱۰۰۔ 'دو بار موت اور دو بار زندگی' سے مراد وہی چیز ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۸ میں کیا گیا ہے کہ تم اللہ کے منکر کس طرح ہوتے ہو، دراں حالیکہ تم مردہ تھے تو اُس نے تمھیں زندگی عطا فرمائی، پھر وہی مارتا ہے، اِس کے بعد زندہ بھی وہی کرے گا۔ پھر تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

۱۰۱۔ اور اُس کا فیصلہ وہی ہے جس سے تم اِس وقت دوچار ہو۔

۱۰۲۔ یعنی رحمت و نقمت، دونوں اُس کے اختیار میں ہیں۔ چنانچہ برق و رعد بھی وہی دکھاتا ہے اور آسمان سے بارش بھی وہی نازل کرتا ہے جس سے رزق و فضل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

۱۰۳۔ یعنی جو تعصبات کے پردے چاک کر کے بات کی طرف متوجہ ہونے والے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بات کو سمجھنے کے لیے یہ شرط اول ہے۔

رَفِيۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الۡعَرۡشِ ۚ يُلۡقِى الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ
عِبَادِهٖ لِيُنۡذِرَ يَوۡمَ التَّلَاقِ ۙ﴿۱۵﴾ يَوۡمَ هُمۡ بٰرِزُوۡنَ ۚ لَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡهُمۡ
شَىۡءٌ ؕ لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ؕ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلۡيَوۡمَ تُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۢ
بِمَا كَسَبَتۡ ؕ لَا ظُلۡمَ الۡيَوۡمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۷﴾
وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡاٰزِفَةِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَى الۡحَنَاجِرِ كٰظِمِيۡنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ

وہ عالی مرتبت ہے، عرش کا مالک ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، اپنے حکم کی روح ڈال دیتا ہے[۱۰۴] تاکہ وہ لوگوں کو ملاقات کے دن سے خبردار کر دے۔ جس دن وہ خدا کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔ اُن کی کوئی چیز بھی خدا سے چھپی ہوئی نہ ہو گی۔ پوچھا جائے گا: آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ واحد و قہار کی! آج ہر شخص کو اُس کی کمائی کا بدلہ ملے گا۔ آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ بے شک، اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ ۱۳-۱۷

اِن کو اُس آفت کے دن سے خبردار کرو، (اے پیغمبر)، جو قریب آ لگی ہے،[۱۰۵] جب کلیجے منہ کو

۱۰۴۔ اِس سے یہاں وحی مراد ہے جس میں امر الٰہی کلام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ اِسے کوئی شخص اپنی خواہش یا کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کے حکم سے نازل ہوتی ہے اور وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس پر نازل کرنی ہے۔ اِس کے سوا اِس کے حصول کا کوئی طریقہ نہیں ہے، الاّ یہ کہ آدمی اپنے آپ کو فریب نفس میں مبتلا کر بیٹھے اور اُسی سے الہام حاصل کرتا رہے، جیسا کہ صوفیانہ مذاہب کے ماننے والوں نے کیا ہے۔

۱۰۵۔ یعنی قیامت سے، جو موت کے دروازے سے گزرتے ہی ہر شخص کے سامنے کھڑی ہو گی۔ پھر یہاں تو مخاطب قریش ہیں، جنھیں جگہ جگہ اُس قیامت صغریٰ سے بھی خبردار کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد گویا اُن کے سر پر کھڑی تھی۔

مِنۡ حَمِیۡمٍ وَّلَا شَفِیۡعٍ یُّطَاعُ ﴿۱۸﴾ یَعۡلَمُ خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾
وَاللّٰہُ یَقۡضِیۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَقۡضُوۡنَ بِشَیۡءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ
ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۲۰﴾

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ
کَانُوۡا ہُمۡ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّاٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ ؕ وَمَا کَانَ
لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ

آرہے ہوں گے اور وہ غم سے گھٹے ہوئے ہوں گے۔ اُس دن ظالموں کا کوئی دوست نہ ہوگا اور نہ کوئی سفارشی، جس کی بات مانی جائے۔ (پھر اُس کے حضور کوئی کیا سفارش کرے گا؟ اِس لیے کہ) اللہ تو نگاہوں کی چوری کو بھی جانتا ہے اور اُن سب بھیدوں کو بھی جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا، (اُس پر کسی کی سفارش اثر انداز نہ ہو گی)۔ اور اللہ کے سوا جن کو یہ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ یقیناً اللہ ہی سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۱۸-۲۰

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اِن سے پہلے گزرے ہیں؟ وہ اِن سے قوت میں بھی اور اُن آثار کے لحاظ سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر تھے جو اُنھوں نے زمین میں چھوڑے ہیں۔[۱۰۶] پھر اُن کے گناہوں کی پاداش میں اللہ نے اُن کو پکڑا اور اُنھیں کوئی اللہ سے بچانے والا نہیں تھا۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں

۱۰۶۔ آیت میں لفظ 'اَشَدّ' 'أَعۡظَمُ وَ أَکۡثَرُ' کے مفہوم پر متضمن ہے، چنانچہ 'اٰثَارًا' کے لیے بھی موزوں ہو گیا ہے۔ یہ عاد و ثمود اور اہل مدین وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کی قوت و جمعیت اور تمدنی ترقیوں کا ذکر پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔

فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

لے کر آتے رہے، پر اُنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا تو اللہ نے اُن کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ طاقت ور ہے، سخت سزا دینے والا ہے۔ ۲۱-۲۲

[باقی]

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: ڈاکٹر محمد عامر گزدر

علامات قیامت

(۹)

زمین کا جانور

— ۱ —

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:[۱] «تَخْرُجُ الدَّابَّةُ فَتَسِمُ النَّاسَ عَلَى خَرَاطِيمِهِمْ، ثُمَّ يَغْمُرُونَ[۲] فِيكُمْ حَتَّى يَشْتَرِيَ الرَّجُلُ الْبَعِيرَ، فَيَقُولُ:[۳] مِمَّنْ اشْتَرَيْتَهُ؟ فَيَقُولُ: اشْتَرَيْتُهُ مِنْ أَحَدِ الْمُخَطَّمِينَ[۴]».

وَعَنْهُ فِي رِوَايَةٍ قَالَ:[۵] قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «تَخْرُجُ الدَّابَّةُ فَتُوسِمُ النَّاسَ عَلَى خَرَاطِيمِهِمْ فَتَبْيَضُّ وُجُوهُ الْمُؤْمِنِينَ، وَتَسْوَدُّ وُجُوهُ الْمُنَافِقِينَ، وَيَمْتَازُ هَؤُلَاءِ عَنْ هَؤُلَاءِ، ثُمَّ يَمُرُّونَ بَعْدَ ذَلِكَ حَتَّى يَشْتَرِيَ الرَّجُلُ الشَّيْءَ، فَيُقَالُ لَهُ: مِمَّنِ اشْتَرَيْتَهُ؟ فَيَقُولُ:

مِنْ أَحَدِ الْمُخَرْطَمِينَ».

ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین کا جانور نکلے گا[1] تو وہ لوگوں کی ناک پر نشان لگا دے گا[2]۔ پھر ایسے نشان زدہ لوگ تم میں بہت ہو جائیں گے، یہاں تک کہ آدمی ایک اونٹ خریدے گا اور کوئی اُس سے پوچھے گا کہ یہ اونٹ تم نے کس سے خریدا ہے؟ وہ جواب میں کہے گا: میں نے یہ نشان زدہ لوگوں میں سے ایک شخص سے خریدا ہے۔

اِنھی ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین کا جانور نکلے گا تو لوگوں کو اُن کے ناک پر گود کر نشان لگا دے گا، جس کے نتیجے میں مومنین کے چہرے سفید اور منافقین کے سیاہ ہو جائیں گے اور اِن دونوں گروہوں کے افراد ایک دوسرے سے الگ پہچانے جائیں گے۔ پھر لوگ اِسی حالت پر رہیں گے، یہاں تک کہ آدمی کوئی چیز خریدے گا تو اُس سے پوچھا جائے گا کہ یہ تم نے کس سے خریدی ہے۔ چنانچہ وہ کہے گا: نشان زدہ لوگوں میں سے ایک شخص سے۔

۱۔ قیامت کی جو دس نشانیاں پیچھے بیان ہوئی ہیں، اُن میں ایک جانور کے نکلنے کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اِس سے کیا مراد ہے؟ اِس کی وضاحت ہم اِس سے پہلے کر چکے ہیں۔ ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اُسی کی تفصیل ہے۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اِسی طرح دکھایا گیا کہ ایک جانور زمین سے نکلا ہے اور اُس نے لوگوں کی ناک کو گود کر اُس پر نشان لگا دیا ہے۔ چنانچہ لوگ اِسی نشان کے حوالے سے اُنھیں الگ پہچانتے اور اِسی کا حوالہ دے کر اُن کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ یہ بالکل اُسی طرح ہے، جیسے یوسف علیہ السلام کے زنداں میں اُن کے ایک ساتھی نے دیکھا کہ اُس کے سر پر روٹیاں ہیں اور اُنھیں پرندے کھا رہے ہیں۔ رؤیا میں حقائق بالعموم اِسی طریقے سے ممثل کیے جاتے ہیں۔ مدعا غالباً یہ تھا کہ اِس جانور کا نکلنا خود مسلمانوں کی جماعت میں مومنین اور منافقین کے درمیان فرق کا باعث بن جائے گا۔ ایمان والے خوشی اور مسرت سے نہال ہوں گے کہ اُن کے پیغمبر کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہو گئی اور منافقین کے چہرے اِس صورت حال کو دیکھ کر اپنے انجام کے خوف سے سیاہ پڑ رہے ہوں گے۔ گویا ’يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ‘ کا منظر اُس زمانے کے لوگ اِس دنیا میں بھی کسی

حد تک دیکھ لیں گے۔ عالمی سطح پر مذہب اور مذہبی فکر کا سیاسی غلبہ ختم ہو جانے کے بعد جو دور الحاد اب شروع ہوا ہے، اُس میں مسلمانوں کے اندر یہ منافقین اب ہم ہر گھر میں دیکھ سکتے ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۲۲۳۰۸ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے متابعات اِن مراجع میں نقل ہوئے ہیں: مسند ابن جعد، رقم ۲۹۱۹۔ اشراط الساعۃ، عبد الملک بن حبیب، رقم ۲۲۔ اخبار اصبہان، ابو نعیم ۸۸/۲۔

۲۔ بعض طرق، مثلاً مسند ابن جعد، رقم ۲۹۱۹ میں 'يَغْمُرُونَ' کے بجاے 'يُعَمَّرُونَ' کا لفظ آیا ہے۔

۳۔ بعض طرق، مثلاً اشراط الساعۃ، عبد الملک بن حبیب، رقم ۲۲ میں یہاں 'فَيَقُولُ' کے بجاے 'فَيُقَالُ لَهُ' کے الفاظ ہیں۔

۴۔ بعض روایتوں، مثلاً مسند ابن جعد، رقم ۲۹۱۹ میں یہاں 'الْمُخَطَّمِينَ' کے بجاے 'الْمُخَرْطَمِينَ' کا لفظ آیا ہے۔

۵۔ اشراط الساعۃ، عبد الملک بن حبیب، رقم ۲۲۔

سورج کا مغرب سے طلوع ہونا

— ۲ —

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:[۱] «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا، فَإِذَا طَلَعَتْ [مِنْ مَغْرِبِهَا[۲]] وَرَآهَا النَّاسُ، آمَنُوا [كُلُّهُمْ[۳]] أَجْمَعُونَ، وَذَلِكَ حِينَ ﴿**لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا**﴾»

[الأنعام: ١٥٨].

وَعَنْهُ قَالَ:[٢] قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللهُ عَلَيْهِ».

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہو گی، جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو جائے۔ پھر جب سورج مغرب سے طلوع ہو گا اور لوگ اُسے دیکھ لیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے۔ تاہم یہ وہ وقت ہو گا، جب کسی ایسے شخص کو اُس کا ایمان کچھ نفع نہ دے گا، جو پہلے ایمان نہ لایا ہو[١] یا اپنے ایمان میں اُس نے کوئی بھلائی نہ کمائی ہو[٢]۔

اِنھی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کر لی، اللہ اُس کی توبہ کو قبول کر لے گا[٣]۔

١۔ اِس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مہلت انسان کو اِس دنیا میں دے رکھی ہے، یہ اُس کے خاتمے کا اعلان ہو گا۔ چنانچہ ایمان والے اُن لوگوں کی بے بسی اِسی دنیا میں دیکھیں گے، جو اِس سے پہلے پیغمبروں کی دعوت کا انکار کرتے رہے تھے۔

٢۔ یعنی ایمان لا کر اپنے علم و عمل میں اُس کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا نہ کیا ہو۔ اِس طرح کا ایمان، قرآن سے بھی واضح ہے کہ کسی کے لیے نافع نہ ہو سکے گا، اِلّا یہ کہ اللہ ہی اپنے قانون کے مطابق کسی کے لیے عفو و درگذر کا کوئی فیصلہ فرما دے۔

٣۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ ابتلا کا قانون اُسی وقت تک جاری رہ سکتا ہے، جب تک پردہ نہ اُٹھ جائے۔ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا یہی پردہ اُٹھا دے گا، لہٰذا توبہ کا دروازہ بھی اُس کے بعد بند ہو جائے گا۔

متن کے حواشی

١۔ اِس روایت کا متن اصلاً مسند احمد، رقم ٨١٣٨ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے متابعات اِن مصادر میں دیکھ لیے

جا سکتے ہیں: صحیفۂ ہمام بن منبہ، رقم ۲۵۔ احادیث اسماعیل بن جعفر، رقم ۲۸۵۔ اشراط الساعۃ، عبد الملک بن حبیب، رقم ۱۶۔ مسند اسحاق بن راہویہ، رقم ۱۷۶۔ مسند احمد، رقم ۷۱۶۱، ۸۸۵۰، ۹۱۷۲، ۱۰۸۵۹۔ صحیح بخاری، رقم ۴۶۳۵، ۴۶۳۶، ۶۵۰۶۔ صحیح مسلم، رقم ۱۵۷۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۴۰۶۸۔ سنن ابو داؤد، رقم ۴۳۱۲۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۱۱۳، ۱۱۱۱۲۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۶۰۸۵، ۶۵۱۷۔ مستخرج ابی عوانۃ، رقم ۳۱۹۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۸۳۸۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۲۱۔ التوحید، ابن مندہ، رقم ۲۹۔ السنن الواردۃ فی الفتن، دانی، رقم ۷۱۰۔

۲۔ صحیح مسلم، رقم ۱۵۷۔

۳۔ مسند احمد، رقم ۸۸۵۰۔

۴۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۹۵۰۹ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے متابعات اِن مراجع میں نقل ہوئے ہیں: تفسیر عبد الرزاق، رقم ۸۶۸۔ مسند احمد، رقم ۱۱۷۷، ۹۱۳۰، ۱۰۴۱۹۔ صحیح مسلم، رقم ۲۷۰۳۔ مسند الحارث، رقم ۱۰۷۷۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۱۱۵۔ معجم ابن اعرابی، رقم ۱۳۲۶، ۱۳۲۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۲۹۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۱۰۲۴، ۱۰۲۵۔ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ، رقم ۱۹۳۴، ۱۹۳۵۔

—— ۳ ——

عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ، قَالَ:[1] قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ مِنْ قِبَلِ مَغْرِبِ الشَّمْسِ بَابًا مَفْتُوحًا لِلتَّوْبَةِ، مَسِيرَةُ عَرْضِهِ[2] سَبْعُونَ [أَوْ أَرْبَعُونَ[3]] سَنَةً، [فَتَحَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ لِلتَّوْبَةِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ[4]] فَلَا يَزَالُ ذَلِكَ الْبَابُ مَفْتُوحًا لِلتَّوْبَةِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ نَحْوِهِ،[5] فَإِذَا طَلَعَتْ مِنْ نَحْوِهِ لَمْ تَنْفَعْ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ، أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا» [وَذَلِكَ قَوْلُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ: **﴿يَوْمَ يَأْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا﴾**

الآيَةَ.[٦]. [الأنعام: ١٥٨].

صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورج کے غروب ہونے کی سمت میں توبہ کا ایک کھلا ہوا دروازہ ہے، جس کی چوڑائی ستر سال یا فرمایا کہ چالیس سال میں طے ہونے والی مسافت ہے۔ توبہ کا یہ دروازہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کی تخلیق کے دن کھولا تھا اور یہ توبہ کے لیے کھلا رہے گا، یہاں تک کہ سورج مغرب کی اِسی سمت سے طلوع ہو جائے۔ سو جب وہ اُدھر سے طلوع ہو گا تو کسی ایسے شخص کو اُس کا ایمان کچھ نفع نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اپنے ایمان میں اُس نے کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد میں بیان ہوئی ہے کہ "جس دن تیرے پروردگار کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو جائے گی[۱] اُس دن کسی ایسے شخص کو اُس کا ایمان کچھ نفع نہ دے گا" (الانعام: ۱۵۸)۔

۱۔ یعنی اِس طرح کی کوئی نشانی ظاہر ہو جائے گی کہ اُس کے بعد کسی کے لیے کچھ کہنے کی گنجایش باقی نہ رہے گی۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن اصلاً مسند ابن ابی شیبہ، رقم ۸۸۲ سے لیا گیا ہے۔ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اِس کے باقی طرق اِن مصادر میں دیکھ لیے جا سکتے ہیں: تفسیر عبد الرزاق، رقم ۸۷۷۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۷۹۵۔ مسند حمیدی، رقم ۹۰۵۔ التفسیر من سنن سعید بن منصور، رقم ۹۴۰۔ مسند احمد، رقم ۱۸۰۹۳، ۱۸۰۹۵، ۱۸۱۰۰۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۴۰۷۰۔ سنن ترمذی، رقم ۳۵۳۵، ۳۵۳۶۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۱۱۴۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم ۱۹۳۔ حدیث السراج، رقم ۲۷۱۰، ۲۷۱۱۔ معجم ابن اعرابی، رقم ۱۴۴۹۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۳۲۱۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۳۴۴۶۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۷۳۴۸، ۷۳۵۲، ۷۳۵۳، ۷۳۵۹، ۷۳۶۰، ۷۳۶۱، ۷۳۸۸۔ جزء الالف دینار، قطیعی، رقم ۹۲۔ سنن دار قطنی، رقم ۷۶۱۔ التوحید، ابن مندہ، رقم ۲۳۵۔ معرفۃ الصحابۃ، ابو نعیم، رقم ۳۸۲۰۔ امالی ابن بشران، رقم ۲۸۵۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۳۴۱۔

شعب الایمان، بیہقی، رقم ۶۶۷۴۔

۲۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۷۳۸۸ میں یہاں 'مَا بَیْنَ مِصْرَاعَیْهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔

۳۔ مسند احمد، رقم ۱۸۰۹۵۔

۴۔ مسند احمد، رقم ۱۸۰۹۵۔

۵۔ بعض روایتوں، مثلاً مسند احمد، رقم ۱۸۰۹۳ میں یہاں 'لَا یُغْلَقُ حَتَّی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ نَحْوِهٖ' کا اسلوب نقل ہوا ہے۔

۶۔ سنن ترمذی، رقم ۳۵۳۶۔

—— ۴ ——

عَنْ أَبِي ذَرٍّ، قَالَ:[۱] قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَبِي ذَرٍّ حِينَ غَرَبَتِ الشَّمْسُ: «أَتَدْرِي أَيْنَ تَذْهَبُ[۲] [الشَّمْسُ؟[۳]]»، قُلْتُ: اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: «فَإِنَّهَا تَذْهَبُ حَتَّى تَسْجُدَ تَحْتَ العَرْشِ [عِنْدَ رَبِّهَا[۴]]، فَتَسْتَأْذِنَ [رَبَّهَا فِي الرُّجُوعِ[۵]] فَيُؤْذَنُ لَهَا، وَيُوشِكُ أَنْ تَسْجُدَ، فَلاَ يُقْبَلَ مِنْهَا، وَتَسْتَأْذِنَ فَلاَ يُؤْذَنَ لَهَا [وَتَسْتَشْفِعَ وَتَطْلُبَ،[۶]] يُقَالُ لَهَا: ارْجِعِي مِنْ حَيْثُ جِئْتِ،[۷] فَتَطْلُعُ مِنْ مَغْرِبِهَا، فَذَلِكَ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ [يٰس: ۳۸]».

وَعَنْهُ فِي رِوَايَةٍ:[۸] أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمًا: «أَتَدْرُونَ أَيْنَ تَذْهَبُ هَذِهِ الشَّمْسُ؟» قَالُوا: اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ: «إِنَّ هَذِهِ تَجْرِي حَتَّى تَنْتَهِيَ إِلَى مُسْتَقَرِّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ، فَتَخِرُّ سَاجِدَةً، فَلَا تَزَالُ كَذَلِكَ حَتَّى يُقَالَ لَهَا: ارْتَفِعِي، ارْجِعِي مِنْ حَيْثُ جِئْتِ، فَتَرْجِعُ

فَتُصْبِحُ طَالِعَةً مِنْ مَطْلِعِهَا، ثُمَّ تَجْرِي حَتَّى تَنْتَهِيَ إِلَى مُسْتَقَرِّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ، فَتَخِرُّ سَاجِدَةً، وَلَا تَزَالُ كَذَلِكَ حَتَّى يُقَالَ لَهَا: ارْتَفِعِي، ارْجِعِي مِنْ حَيْثُ جِئْتِ، فَتَرْجِعُ فَتُصْبِحُ طَالِعَةً مِنْ مَطْلِعِهَا، ثُمَّ تَجْرِي لَا يَسْتَنْكِرُ النَّاسُ مِنْهَا شَيْئًا حَتَّى تَنْتَهِيَ إِلَى مُسْتَقَرِّهَا ذَاكَ تَحْتَ الْعَرْشِ، فَيُقَالُ لَهَا: ارْتَفِعِي أَصْبِحِي طَالِعَةً مِنْ مَغْرِبِكِ، فَتُصْبِحُ طَالِعَةً مِنْ مَغْرِبِهَا»، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَتَدْرُونَ مَتَى ذَاكُمْ؟ ذَاكَ حِينَ ﴿لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا﴾ [الأنعام: ١٥٨]».

ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) سورج غروب ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوذر، کیا تمھیں معلوم ہے کہ سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ عرش کے نیچے اپنے رب کے پاس پہنچ کر سجدہ ریز ہوتا ہے۔ پھر اپنے رب سے لوٹ جانے کی اجازت مانگتا ہے تو اِس کو اجازت دی جاتی ہے[1]۔ وہ دن قریب ہے جب یہ (اپنے رب کو) سجدہ کرے گا تو اِس کا سجدہ قبول نہ ہو گا اور واپسی کے لیے اجازت طلب کرے گا، لیکن اِس کو اجازت نہیں ملے گی[2]۔ یہ سفارش چاہے گا اور درخواست کرے گا[3] تو اِس کو کہا جائے گا: جہاں سے آئے ہو، وہیں چلے جاؤ، چنانچہ (اُس دن) یہ اپنے غروب ہونے کی جگہ سے طلوع ہو گا۔ اِسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''سورج اپنے ایک مقرر راستے پر چلتا ہے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کا باندھا ہوا اندازہ ہے'' (یٰس ۳۸:۳۶)۔

اِنھی ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ سورج کہاں جاتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اُس کا رسول ہی

بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ عرش الٰہی کے نیچے اپنے مستقر پر پہنچ کر سجدہ ریز ہو جاتا اور اِسی حالت میں رہتا ہے، یہاں تک کہ اِس سے کہا جاتا ہے: اٹھو، جہاں سے آئے تھے، وہیں لوٹ جاؤ۔ چنانچہ وہ واپس لوٹتا اور اپنے مطلع سے طلوع ہو جاتا ہے۔ پھر چلتا ہوا عرش الٰہی کے نیچے اپنی جاے قرار پر پہنچ کر سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اِسی حالت میں رہتا ہے، یہاں تک کہ اِس سے کہا جاتا ہے: بلند ہو جاؤ، جہاں سے آئے تھے، وہیں لوٹ جاؤ، لہٰذا وہ واپس جاتا اور اپنے مطلع سے طلوع ہو جاتا ہے۔ پھر (ایک دن) یہ چلے گا، لوگ اِس میں معمول سے ہٹی ہوئی کوئی چیز نہیں پائیں گے، یہاں تک کہ یہ عرش الٰہی کے سایے میں اپنے اُسی مستقر پر پہنچے گا تو اِس سے کہا جائے گا: اُٹھو اور اپنے غروب ہونے کے مقام سے طلوع ہو جاؤ، سو (اُس دن) یہ اپنے مغرب سے طلوع ہو گا۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ کب ہو گا؟ یہ اُس وقت ہو گا ”جب کسی ایسے شخص کو اُس کا ایمان کچھ نفع نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اپنے ایمان میں اُس نے کوئی بھلائی نہ کمائی ہو“ (الانعام ۶:۱۵۸)۔

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ غالباً اِسی طرح رؤیا میں دکھایا گیا۔ دنیا جن سائنسی قوانین کے تحت چل رہی ہے، اُن کے پیچھے اصل حقیقت کیا ہے؟ یہ اُس کی تمثیل تھی اور مدعا یہ تھا کہ لوگ اِس تمثیل کے آئینے میں کائنات کے ظاہر کے ساتھ، اِس کے باطن کو بھی دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔

۲۔ سجدہ کی حقیقت مطیع و منقاد اور مسخر ہونا ہے۔ یہ تعبیر یہاں اُسی طرح کے مفہوم کے لیے اختیار کی گئی ہے جو زمین و آسمان کی ہر چیز، بلکہ اُن کے سایوں کے سجدے کے لیے قرآن میں ملحوظ ہے۔ یہ استدلال کی ایک خاص قسم ہے، جسے اشارات سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اِس میں ذہن کو علامت سے حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے، چنانچہ سورۂ رعد (۱۳) کی آیت ۱۵ میں، جہاں سایوں کے سجدے کا ذکر ہوا ہے، وہاں اِسی حقیقت کے پیش نظر یہ تعبیر اختیار فرمائی اور اِس طرح گویا مخاطب کو توجہ دلائی ہے کہ دیکھ لو، چیزوں کے سایے بھی رات بھر سجدے میں گرے رہتے ہیں، صبح کو آہستہ آہستہ سر اُٹھاتے اور زوال آفتاب کے بعد ایک مرتبہ پھر اُسی پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس قانون کا سورج کروڑوں سال سے پابند رہا ہے، اُس دن وہ اُلٹ دیا جائے گا اور اُس کو پہلے سے مقرر راستے پر طلوع و غروب کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

۳۔ یعنی پریشانی کے عالم میں فرشتوں کی سفارش چاہے گا۔ یہ جس عالم کے حقائق ہیں، اُس کے بارے میں قرآن نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں متنبہ کیا ہے کہ اُس میں ہر چیز اپنے پروردگار کی تسبیح کرتی ہے، مگر تم اُس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ یہی معاملہ اِس سجدے اور سفارش کا بھی ہے۔ اِس طرح کی چیزوں کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: ﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [بنی اسرائیل ۱۷: ۸۵]۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۳۱۹۹ سے لیا گیا ہے۔ متن کے کچھ اختلاف کے ساتھ ابوذر رضی اللہ عنہ کی اِس روایت کے باقی طرق اِن مصادر میں نقل ہوئے ہیں: مسند احمد، رقم ۲۱۴۵۹۔ صحیح بخاری، رقم ۷۴۲۴۔ صحیح مسلم، رقم ۱۵۹۔ سنن ترمذی، رقم ۲۱۸۶، ۳۲۲۷۔ مسند بزار، رقم ۴۰۱۰، ۴۰۱۱، ۴۰۱۴۔ تعظیم قدر الصلاۃ، مروزی، رقم ۳۲۰۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۱۱۱، ۱۱۳۶۶۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳۔ شرح مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۲۸۱۔ تفسیر ابن ابی حاتم، رقم ۸۱۴۳۔ معجم الصحابۃ، ابن قانع ۱/ ۱۳۵۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۱۵۳، ۶۱۵۴۔ جزء الالف دینار، قطیعی، رقم ۱۱۶۔ العظمۃ، ابوالشیخ اصبہانی ۴/ ۱۱۸۹۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵۔ التوحید، ابن مندہ، رقم ۲۶، ۲۸۔ معرفۃ الصحابۃ، ابونعیم، رقم ۱۵۷۸۔ حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، ابونعیم ۴/ ۲۱۶۔ الاسماء والصفات، بیہقی، رقم ۸۳۶۔

۲۔ بعض طرق، مثلاً السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۳۶۶ میں یہاں ’تَذْهَبُ‘ کے بجائے ’تَغْرُبُ‘ کا لفظ آیا ہے، جب کہ بعض روایتوں، مثلاً مسند بزار، رقم ۴۰۱۰ میں ’تَغِيبُ‘ کا لفظ ہے۔

۳۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۱۵۳۔

۴۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۱۰۱۲۔

۵۔ مسند بزار، رقم ۴۰۱۴۔

۶۔ صحیح ابن حبان ۶۱۵۴۔

۷۔ بعض روایتوں، مثلاً السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۳۶۶ میں یہاں ’اطْلُعِي مِنْ مَكَانِكِ‘ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۸۔ صحیح مسلم، رقم ۱۵۹۔

آگ

۵

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، قَالَ:[۱] قَالَ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «سَتَخْرُجُ [عَلَيْكُمْ[۲]] نَارٌ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ[۳] مِنْ بَحْرِ حَضْرَمَوْتَ، أَوْ مِنْ حَضْرَمَوْتَ تَحْشُرُ[۴] النَّاسَ»، قَالُوا: فَبِمَ تَأْمُرُنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: «عَلَيْكُمْ بِالشَّامِ».

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: قیامت سے پہلے تمھارے سامنے حضرموت یا فرمایا کہ حضرموت کے سمندر کی طرف سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو اکٹھا کرے گی[۱]۔ لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول، (اُس وقت کے لیے) آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم شام چلے جانا[۲]۔

۱۔ قیامت کی دس نشانیوں میں عدن سے جس آگ کے نکلنے کا ذکر ہوا ہے، یہ اُسی کا بیان ہے۔ یہاں اِس کی جگہ حضرموت بتائی گئی ہے۔ یہ عدن کے مشرق میں سمندر کے قریب ایک وسیع علاقے کا نام ہے، لہٰذا محل وقوع کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ روایتوں کے مطابق یہ وقوع قیامت کی پہلی اور تمام نشانیوں میں آخری نشانی ہے، جس کے بعد وہ ہوا چلے گی جو لوگوں کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔

۲۔ یہ اُس سے دور چلے جانے کی ہدایت ہے، جو آپ نے ایک علاقے کا نام لے کر مخاطبین کے لحاظ سے فرمائی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آفت جیسی بھی ہمہ گیر ہو، انسان کو اُس سے بچنے کے لیے اپنی سی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۵۱۴۶ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے متابعات اِن مصادر میں نقل ہوئے ہیں: مشیخۃ ابن طہمان، رقم ۲۰۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۷۳۲۰۔ مسند احمد، رقم ۴۵۳۶، ۵۳۷۶، ۵۷۳۸، ۶۰۰۲۔ سنن ترمذی، رقم ۲۲۱۷۔ المعرفۃ والتاریخ، یعقوب فسوی ۳۰۲/۲۔ مسند بزار، رقم ۶۰۴۴۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۵۵۵۱۔ فوائد ابن دحیم، رقم ۶۷، ۸۴۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۳۰۵۔ فوائد ابن بشران، رقم ۷۰۶۔

۲۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۳۰۵۔

۳۔ بعض طرق، مثلاً المعرفۃ والتاریخ، یعقوب فسوی ۳۰۲/۲ میں یہاں 'قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ' کے بجائے 'فِي آخِرِ الزَّمَانِ' کے الفاظ آئے ہیں۔

۴۔ بعض روایتوں، مثلاً مسند ابی یعلیٰ، رقم ۵۵۵۱ میں یہاں 'تَحْشُرُ' کے بجائے 'تَسُوقُ' کا لفظ آیا ہے۔

— ٦ —

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ:[1] «يُحْشَرُ النَّاسُ عَلَى ثَلَاثِ طَرَائِقَ رَاغِبِينَ رَاهِبِينَ، وَاثْنَانِ عَلَى بَعِيرٍ، وَثَلَاثَةٌ عَلَى بَعِيرٍ، وَأَرْبَعَةٌ عَلَى بَعِيرٍ، وَعَشَرَةٌ عَلَى بَعِيرٍ، وَتَحْشُرُ بَقِيَّتَهُمُ النَّارُ تَبِيتُ مَعَهُمْ حَيْثُ بَاتُوا، وَتَقِيلُ مَعَهُمْ حَيْثُ قَالُوا، وَتُصْبِحُ مَعَهُمْ حَيْثُ أَصْبَحُوا، وَتُمْسِي مَعَهُمْ حَيْثُ أَمْسَوْا».

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (قیامت سے پہلے) لوگوں کو تین طریقوں سے (اِسی دنیا میں) اکٹھا کیا جائے گا[1]: (کچھ) لوگ خوف ورجا

کے عالم میں ہوں گے اور دو لوگ ایک اونٹ پر سوار ہوں گے اور تین افراد ایک اونٹ پر اور چار ایک اونٹ پر اور دس ایک اونٹ پر[2]۔ اور باقی لوگوں کو آگ اکٹھا کر کے لائے گی، جہاں لوگ رات گزاریں گے، یہ آگ اُن کے ساتھ وہیں رات گزارے گی، جہاں وہ قیلولہ کریں گے، اُن کے ساتھ وہیں قیلولہ کرے گی، جہاں وہ صبح کریں گے، وہیں اُن کے ساتھ صبح کرے گی اور جہاں وہ شام کریں گے، اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہی ہو گی[3]۔

۱۔ آگے جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اگر اِنھی طریقوں کی وضاحت ہے تو مدعا غالباً یہ ہو گا کہ کچھ لوگ خوف و رجا کے عالم میں پیدل چل رہے ہوں گے، کچھ سواریوں پر ہوں گے، خواہ دس لوگوں کو ایک ہی اونٹ میسر ہو سکے اور زیادہ وہ ہوں گے، جنھیں آگ ہانکے گی، وہ خود جمع ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

۲۔ آخری زمانے میں اونٹوں کے ذکر سے کسی کو تعجب نہ ہو۔ یہ رؤیا کے مشاہدات ہیں۔ اِن میں مستقبل کے واقعات اِسی طرح تمثیلات کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں۔

۳۔ مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ اُن کا پیچھا کرے گی، یہاں تک کہ وہ اُس مقام تک پہنچ جائیں، جہاں اُن کے لیے قیامت کا صور پھونک دیا جائے گا۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۲۸۶۱ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی تنہا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔
اِس کے متابعات اِن مصادر میں دیکھ لیے جا سکتے ہیں: صحیح بخاری، رقم ۶۵۲۲۔ الاہوال، ابن ابی الدنیا، رقم ۲۳۵۔ السنن الصغریٰ، نسائی، رقم ۲۰۸۵۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۲۲۲۳۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۳۳۶۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۵۱۰۷۔ البعث والنشور، بیہقی، رقم ۲۷۴۔ شعب الایمان، بیہقی، رقم ۳۵۳۔

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

میزان —— توضیحی مطالعہ

اصول و مبادی

(۱)

اصول و مبادی کے باب کے تمہیدی حصے میں اسلام کا تعارف کراتے ہوئے مصنف نے فطرت اور دین کے باہمی تعلق، دین کے ماخذ، مصادر دین کے قطعی تاریخی ثبوت اور دینی علم میں اخبار آحاد کی حیثیت و اہمیت جیسے نکات پر اصولی بات کی ہے۔ ذیل میں ان مباحث کی توضیح پیش کی جائے گی۔

دین اور فطرت کا باہمی تعلق

”دین اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اُس نے پہلے انسان کی فطرت میں الہام فرمائی اور اِس کے بعد اُس کی تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسان کو دی ہے۔“ (میزان ۱۳)

یہ مصنف کے تصور دین کا بنیادی نکتہ ہے، جس کا ماخذ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ

”سو ایک خدا کے ہو کر تم اپنا رخ اُس کے دین کی طرف کیے رہو۔ تم اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کی پیروی کرو، جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ. (الروم ۳۰:۳۰) اللہ کی بنائی ہوئی اِس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

اس آیت کے تحت مصنف نے "البیان" میں لکھا ہے:

"مطلب یہ ہے کہ یہ دین کوئی خارج کی چیز نہیں ہے جو اوپر سے تم پر لادی جا رہی ہے۔ یہ عین تمھاری فطرت کا ظہور ہے۔ اِس سے اختلاف کرو گے تو گویا اپنے ساتھ اختلاف کرو گے اور اپنے ہی باطن میں چھپے ہوئے خزانے سے اپنے آپ کو محروم کر لو گے۔ ... انبیا علیہم السلام اِسی فطرت کی تفصیل کرتے اور اِس کے تمام مقتضیات و لوازم کو انسان کے لیے واضح کر دیتے ہیں۔ قرآن نے 'ذِکۡر' اور 'ذِکۡرٰی' کا لفظ اِسی پہلو سے اپنے لیے استعمال کیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ وہ در حقیقت اُنھی حقائق کی یاد دہانی کرتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہیں، لیکن وہ اُنھیں فراموش کر بیٹھتا ہے۔" (۴/ ۵۸، ۵۹)

اس کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل مصنف نے کتاب کے مختلف مباحث میں اور اپنی دیگر تحریروں میں بیان کی ہے جو یہاں پیش نظر رہنے چاہییں۔

فطرت کا مفہوم اور مشمولات

"دین فطرت" کے زیر عنوان اپنی تحریر میں مصنف نے فطرت کا مفہوم یوں واضح کیا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کو اُس کے جن خصائص کے ساتھ پیدا کیا ہے، وہی اُس کی فطرت ہے۔ انسان کی خلقت میں اِن خصائص کا ظہور اُس کے جبلی داعیات، جذبات و احساسات اور اُس کے اضطراری علم کی صورت میں ہوتا ہے۔" (ماہنامہ اشراق، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۴)

فطرت کی اس تعریف میں جبلی داعیات، (مثلاً خوراک کی طلب اور جنسی تسکین کا داعیہ) اور جذبات و احساسات (جیسے خوف، محبت، غصہ اور رنج) کا مفہوم واضح ہے۔ اضطراری علم سے مصنف نے اپنی مراد "علم کی بنیاد" کے زیر عنوان ایک تحریر میں یوں واضح کی ہے کہ انسان کی فطرت میں کچھ حقائق اور الہامات ودیعت کیے گئے ہیں جنھیں انسان پیدایشی طور پر اپنے اندر موجود پاتا اور ان کو اضطراراً قبول کرتا ہے (مقامات ۱۲۵)۔ ان میں سب سے بنیادی چیز موجودات سے متعلق، چاہے وہ مادی ہوں یا شعوری و ذہنی، ایسے احکام ہیں جو انسان کے علم اور عقلی استدلال کے لیے بنیاد بنتے ہیں اور عقل ان کے آگے محکوم محض ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے

عالم خارجی کے موجود ہونے پر یقین، نفس انسانی کے عالم خارجی سے الگ ہونے کے شعور، حامل و محمول یا ذات اور اس کے عوارض کے مابین فرق کے ادراک، ذات کے بغیر صفات کے ناممکن ہونے کے شعور، اپنے فعل و تصرف اور عالم خارجی کے انفعال و تاثر پر نفس کے یقین، مدرک اور غیر مدرک میں امتیاز، نفس کے مرغوبات و مکروہات اور اپنے اختیار و تصرف کے یقین جیسے امور کو فطری اور اضطراری علم میں شمار کیا ہے۔[1] مصنف کے نزدیک یہ اولیات اور بدیہیات سے مقدم ہوتے ہیں، کیونکہ اولیات اور بدیہیات بھی اپنے تحقق کے لیے ان فطری احکام کے محتاج ہوتے ہیں۔

فطری الہامات میں وہ بنیادی احساسات اور تصورات بھی شامل ہیں جو انبیا کی دعوت کی بنیاد بنتے ہیں۔ اس ضمن میں مصنف نے سب سے بنیادی الہام خدا کی ربوبیت کے اقرار کو شمار کیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے:

> ’’خدا کی ربوبیت کا اقرار ایک ایسی چیز ہے جو ازل ہی سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ اِس کا اولین ظہور ایک عہد و میثاق کی صورت میں ہوا تھا۔ اِس عہد کا ذکر قرآن ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کرتا ہے۔ انسان کو یہاں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اِس لیے یہ واقعہ تو اُس کی یادداشت سے محو کر دیا گیا ہے، لیکن اِس کی حقیقت اُس کے صفحۂ قلب پر نقش اور اُس کے نہاں خانۂ دماغ میں پیوست ہے، اِسے کوئی چیز بھی محو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ماحول میں کوئی چیز مانع نہ ہو اور انسان کو اِسے یاد دلایا جائے تو وہ اِس کی طرف اِس طرح لپکتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے۔‘‘(میزان ۹۱-۹۲)

مصنف کی رائے میں عہد الست پر مبنی ’’انسان کے باطن کی یہ شہادت ایسی قطعی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے، ہر شخص مجرد اِس شہادت کی بنا پر اللہ کے حضور میں جواب دہ ہے‘‘(میزان ۹۲)۔

فطرت میں ودیعت کیے گئے حقائق میں دوسری اہم چیز حسن و قبح کا شعور ہے۔ یہ بھی مصنف کے نزدیک اسی اضطراری علم کا حصہ ہے جو پیدایش کے ساتھ ہی انسان کے اندر الہام کر دیا گیا ہے اور جو بیدار ہوتے ہی ’’اشیا اور افعال، دونوں پر اپنا حکم لگانا شروع کر دیتا ہے۔‘‘ حسن و قبح کے شعور کے زیر اثر انسان جن چیزوں پر حکم لگاتا ہے، مصنف نے ان کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

> ’’ایک، بدن کا حسن، جس کا لازمی نتیجہ طہارت اور نجاست کے مابین فرق کا شعور ہے۔
>
> دوسرے، خور و نوش کی چیزوں کا حسن، جس کا لازمی نتیجہ اُن کے طیبات و خبائث کے مابین فرق کا شعور

۱۔ ان امور کی توضیح محولہ ’’مقامات‘‘ کی محولہ بالا تحریر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ہے۔

تیسرے، نیت، ارادے اور اعمال کا حسن، جس کا لازمی نتیجہ معروف اور منکر کے مابین فرق کا شعور ہے۔“

(ماہنامہ اشراق، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۴)

مذکورہ توضیحات اور دیگر مختلف مباحث میں مصنف کے بیانات کو پیش نظر رکھا جائے تو فطرت کا ایک جامع مفہوم سامنے آتا ہے، جو درج ذیل امور کو محیط ہے:

۱۔ عالم وجود سے متعلق انسانی شعور میں موجود اضطراری احکام۔

۲۔ اپنے مخلوق ہونے اور خدا کی ربوبیت کا شعور۔

۳۔ خالق کے روبرو عجز و تواضع کا احساس اور اس کی پرستش کا جذبہ۔

۴۔ حاسۂ اخلاقی، یعنی خیر و شر میں امتیاز کا شعور۔

۵۔ بدنی طہارت و نجاست اور خورونوش میں طیبات و خبائث کا امتیاز۔

۶۔ حسن و جمال کا احساس اور حصول کمال کا داعیہ۔

۷۔ معاشرت کو تعاون باہمی اور عدل و احسان پر قائم کرنے کا داعیہ۔

۸۔ منکرات کی مزاحمت اور معروفات کی حمیت و حمایت کا جذبہ۔

اس جامع مفہوم کی روشنی میں فطرت اور دین کے باہمی تعلق کے حوالے سے مصنف کے نقطۂ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے، جس کی تفصیل مصنف نے موقع بہ موقع کتاب کے مختلف مباحث میں کی ہے۔

فطری ہدایت اور انبیا کے دین کا باہمی تعلق

انسان کے فطری علم اور انبیا کی وساطت سے انسان کو دی جانے والی ہدایت کے باہمی تعلق کی وضاحت مصنف نے ”نبی کی ضرورت“ کے زیر عنوان یوں کی ہے کہ نبی کی ضرورت دراصل انسان کو پروردگار کی معرفت اور اس کی عدالت سے روشناس کرانے یا خیر و شر اور نیکی و بدی میں امتیاز کی پہچان کے لیے نہیں ہے، کیونکہ ”یہ سب چیزیں تو اُس کی خلقت کا حصہ اور اُس کی تخلیق کے پہلے دن ہی اُس کی فطرت میں ودیعت ہیں“ (میزان ۱۳۲)۔ مصنف کے نزدیک انبیا کی بعثت دراصل اتمام ہدایت یا اتمام حجت کے لیے کی جاتی ہے۔ اتمام ہدایت سے مصنف کی مراد یہ ہے کہ انسان کو فطری طور پر جن چیزوں کا اجمالی علم دیا گیا ہے، اس کو اس کی یاددہانی کرائی جائے اور اس کی ضروری تفصیلات کو متعین کر دیا جائے (میزان ۱۳۲)۔

انبیا کے دین کو دین فطرت قرار دینے کی وضاحت بھی مصنف نے اسی نکتے کی روشنی میں کی ہے۔ دین اصلاً انسان سے انھی تین چیزوں، یعنی تطہیر بدن، تطہیر خور ونوش اور معروف ومنکر کے امتیاز کو ملحوظ رکھنے کا مطالبہ کرتا ہے، جن کا شعور اور جن کی تکمیل کا داعیہ انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ دین کا مقصد خلق اور خالق کے ساتھ انسان کے تعلقات وروابط کی تطہیر ہے اور اس کو دین فطرت اسی پہلو سے کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی فطرت ہی کے دواعی اور تقاضوں کی تفصیلات اور لوازم ومقتضیات کو بیان کرتا ہے (ماہنامہ اشراق، اکتوبر ۲۰۲۴ء، ص ۶)۔

اخلاقیات کی بحث میں مصنف نے مزید واضح کیا ہے کہ فطری ہدایت کی تعبیر اور تفصیل میں چونکہ اختلافات بھی عین ممکن تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انبیا کے ذریعے سے اس نوعیت کے بڑے اختلافات کا بھی فیصلہ فرما دیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

"اِس الہام کی تعبیر میں، البتہ اشخاص، زمانے اور حالات کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اِس کی گنجایش بھی اُس نے باقی نہیں رہنے دی اور جہاں کسی بڑے اختلاف کا اندیشہ تھا، اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے خیر وشر کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اِن پیغمبروں کی ہدایت اب قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ ہے۔" (میزان ۲۰۳)

انبیا کی پیش کردہ ہدایت سے بہرہ مند ہونے، فطرت میں رکھی گئی ہدایت کی قدر دانی سے مشروط ہونے کا نکتہ مصنف نے "ہدایت وضلالت" کے زیر عنوان اس طرح واضح کیا ہے:

"قرآن نے بتایا ہے کہ یہ ہدایت اُس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ پھر شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد زمین و آسمان کی نشانیاں اُس کی طرف اُسے متوجہ کرتی ہیں۔ انسان اگر اِس ہدایت کی قدر کرے، اِس سے فائدہ اٹھائے اور خدا کی اِس نعمت پر اُس کا شکر گزار ہو تو خدا کی سنت ہے کہ وہ اِس کی روشنی کو اُس کے لیے بڑھاتا، اُس کے اندر مزید ہدایت کی طلب پیدا کرتا اور اِس کے نتیجے میں انبیا علیہم السلام کی لائی ہوئی ہدایت سے اُس کو بہرہ یاب ہونے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔" (میزان ۱۱۶)

اصول ومبادی میں "دین کی آخری کتاب" کے عنوان کے تحت مصنف نے بیان کیا ہے کہ قرآن چونکہ اس پورے سلسلۂ ہدایت کی آخری کتاب ہے، اس لیے وہ اپنی دعوت تین چیزوں کو پہلے سے موجود اور معلوم مان کر پیش کرتا ہے۔ ان تین میں سے پہلی چیز "فطرت کے حقائق" ہیں، جن کی تشریح مصنف نے یوں کی ہے:

”پہلی چیز کا تعلق ایمان و اخلاق کے بنیادی حقائق سے ہے اور اُس کے ایک بڑے حصے کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف و منکر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت ابا کرتی اور اُنھیں برا سمجھتی ہے۔“ (میزان ۴۶)

الکتاب، یعنی شریعت اور قانون سے متعلق مصنف نے بتایا ہے کہ یہ اخلاقیات ہی کی فرع ہے اور شرعی اوامر و نواہی کا مقصد انسان کا تزکیۂ اخلاق ہے۔ مصنف کے الفاظ میں:

”ایمان کے بعد دین کا اہم ترین مطالبہ تزکیۂ اخلاق ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خلق اور خالق، دونوں سے متعلق اپنے عمل کو پاکیزہ بنائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے ’عمل صالح‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تمام شریعت اِسی کی فرع ہے۔“ (میزان ۲۰۱)

مصنف نے شریعت کے، تزکیۂ اخلاق پر مبنی اور اس کی فرع ہونے کے پہلو کو ہر دائرے میں شریعت کے احکام کی وضاحت کرتے ہوئے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ چنانچہ ”قانون عبادات“ میں خالق کی پرستش کو انسان کا فطری جذبہ قرار دیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اس کی مختلف اور معروف صورتیں دنیا کے تمام مذاہب میں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔ انبیا کے دین میں مراسم عبادت مقرر کیے جانے کا مقصد خالق کے ساتھ انسان کے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار کرنا ہے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ اس تعلق کا اظہار پرستش، اطاعت اور حمیت و حمایت کی صورت میں ہوتا ہے اور نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور قربانی کی عبادات انسان کو انھی تین پہلوؤں کی یاددہانی اور تربیت کے لیے مقرر کی گئی ہیں (میزان ۲۶۷)۔

”قانون معاشرت“ میں مصنف نے خاندان کو انسان کی فطری ضرورتوں کی تکمیل کرنے والے ادارے کے طور پر بیان کیا اور جنسی تعلق کے حوالے سے قریبی رشتوں کی حرمت اور تقدس کو پاکیزگی کے فطری احساس پر مبنی قرار دیا ہے۔ اس باب میں شریعت نے جو احکام و قوانین مقرر کیے ہیں، ان کا مقصد خاندانی حقوق و فرائض کو صحیح اساسات پر استوار کرنا اور رشتوں اور تعلقات کا تزکیہ و تطہیر ہے (میزان ۴۱۱)۔

قانون سیاست کا مقصود نظم اجتماعی کی تطہیر اور ان اخلاقی اساسات اور ذمہ داریوں کی تعیین ہے جن پر اس کو استوار ہونا چاہیے (میزان ۴۸۵)۔ ”قانون جہاد“ میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی فتنہ وفساد کے دفیعہ کو تہذیب و تمدن کی ایک ناگزیر ضرورت قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ شریعت کی مقرر کردہ وہ حدود اور شرائط کیا ہیں جن کی پابندی کرتے ہوئے اہل ایمان پر انسانی تمدن سے شر و فساد کا خاتمہ کرنے اور منکرین حق کے خلاف

اقدام کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے (میزان ۵۸۰)۔ شریعت کے ضابطۂ حدود و تعزیرات کی وضاحت بھی اسی نکتے کی روشنی میں کی گئی ہے (میزان ۶۱۱)۔ ''قانون دعوت'' کا موضوع حق کی تبلیغ و اشاعت کے حوالے سے ذمہ داریوں اور حدود کا تعین ہے جن کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس فریضے کو بجالایا جا سکے (میزان ۵۳۴)۔

''قانون معیشت'' میں معاشی تعاون و تناصر کو انسانی سماج کی ناگزیر ضرورت کے طور پر بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ شریعت میں ایسے طریقوں سے دوسروں کا مال کھانے کی ممانعت کی گئی ہے جو عدل و انصاف، معروف، دیانت اور سچائی کے خلاف ہیں۔ ان ہدایات کا مقصد معاشی عمل اور معاشی جدوجہد میں انسان کو ان اخلاقی حدود کو پابند بنانا ہے جن کی پامالی سے تمدن اور معاشرت فساد کی آماج گاہ بن جاتے ہیں (میزان ۴۹۹، ۵۰۰)۔

''خورونوش'' کے باب میں شریعت کے احکام کھانے پینے میں طیب اور خبیث کے فرق کو متعین کرتے ہیں، جس کی پابندی تزکیۂ نفس کے پہلو سے ضروری ہے (میزان ۶۳۲)۔ اس ضمن میں مصنف نے بتایا کہ اس باب میں انسان طیب اور خبیث اشیا کا فرق عموماً اپنی فطرت کی روشنی میں کرتے رہے ہیں، جب کہ شریعت نے اصلاً انھی چیزوں کو اپنا موضوع بنایا ہے جن کی حلت و حرمت کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا انسان کے لیے اپنے فطری علم کی روشنی میں ممکن نہیں تھا۔

جسمانی صحت و صفائی اور میل جول کے آداب کے حوالے سے مقرر کیے گئے رسوم کا مقصد بھی معاشرت اور تمدن کو پاکیزہ بنیادوں پر استوار کرنا ہے (میزان ۶۴۲)۔ قسم اور کفارۂ قسم کے احکام عہد کی پابندی اور اس پر خدا کو گواہ مقرر کرنے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں، جس پر انسانی تمدن کی صلاح و فلاح کا مدار ہے (میزان ۶۵۰)۔

فطری اخلاقیات اور شریعت کے باہمی تعلق کے حوالے سے کچھ مزید ''توضیحات'' ''اخلاقیات'' کے باب میں پیش کی جائیں گی۔

علماے کلام کا نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہدایت کی بنیاد انسانی فطرت میں ہونے اور انسانی عقل میں اس کی پہچان اور قبولیت کی استعداد موجود ہونے کا نکتہ اصولی طور پر اہل علم کے ہاں مسلم ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ انسان کو جس چیز کی دعوت دی جائے، اس کا فی الجملہ شعور اور اس کو قبول کرنے کی طرف رجحان انسان کی فطرت میں موجود ہونا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر انسان کو خارجی طور پر کسی رہنمائی کا مخاطب نہیں بنایا جا سکتا۔ ابن عبد البر نے اہل علم کی ایک جماعت کا قول نقل کیا ہے:

لم يكن الله ليدعو خلقه إلى الإيمان به وهو لم يعرفهم نفسه إذ يكون حينئذ قد كلفهم الإيمان بما لا يعرفون. (التمہید ۱۱/۳۷۵)

”ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو اپنے اوپر ایمان کی دعوت دے، جب کہ اس نے ان کو اپنی پہچان نہ کرائی ہو، کیونکہ اس کا مطلب یہ بنے گا کہ اللہ نے انھیں ایسی چیز پر ایمان کا مکلف ٹھیرایا ہے جس سے وہ واقف ہی نہیں۔“

ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

ولهذا كل من تطلب معرفته بالدليل فلا بد أن يكون مشعورًا به قبل هذا، حتى يطلب الدليل عليه أو على بعض أحواله. وأما ما لا تشعر به النفس بوجه فلا يكون مطلوبًا لها.

(درء تعارض العقل والنقل ۸/۵۳۲)

”اسی لیے ضروری ہے کہ دلیل سے جس چیز کی بھی معرفت مقصود ہو، اس کا شعور انسان کو پہلے سے حاصل ہو تا کہ اس پر یا اس کے بعض احوال پر دلیل طلب کی جا سکے۔ جس چیز کا نفس مطلقاً شعور ہی نہ رکھتا ہو، وہ اس کا مطلوب نہیں ہو سکتی۔“

البتہ اس بحث کی تفصیلات میں مختلف کلامی مکاتب فکر کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم سوال فطری ہدایت کی نوعیت اور اس کے دائرے سے متعلق ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک فطرت کا مفہوم قبول حق کی استعداد اور صلاحیت تک محدود ہے اور اس سے بڑھ کر کسی خاص حقیقت، مثلاً خدا کے وجود کا شعور اس میں شامل نہیں ہے۔ وجود باری اور دیگر حقائق کی معرفت انسان کو دنیا میں آنے کے بعد عقلی استدلال اور فکر و نظر کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک خالق کی معرفت اور توحید بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے، تاہم یہ اضطراری معرفت، ایمان کے ہم معنی نہیں ہے اور نہ محض اس معرفت کی بنیاد پر آدمی اجر و ثواب کا حق دار ہو سکتا ہے، بلکہ ایمان اس معرفت کی بنیاد پر شعوری طور پر اور ارادہ و اختیار کے ساتھ کیے جانے والے اقرار و اعتراف کا نام ہے۔ تیسرے گروہ کے نزدیک خدا کی معرفت کے ساتھ ساتھ اسلام، یعنی انبیا علیہم السلام کی بیان کردہ تعلیمات بھی مجموعی اور اصولی لحاظ سے انسانی فطرت میں شامل ہیں۔[۲]

۲۔ ان اقوال کی تفصیل کے لیے دیکھیے: تفسیر القرطبی، سورۃ الروم، آیت ۳۰۔ علی بن عبد اللہ القرنی، الفطرة: حقيقتها ومذاهب الناس فيها، دار المسلم للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۴۲۴ھ۔

ان میں سے آخری نقطۂ نظر ابن تیمیہ، ابن القیم اور شاہ ولی اللہ نے بھی اختیار کیا ہے اور جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، مصنف کا موقف بھی اسی کے قریب تر ہے۔ چنانچہ ابن تیمیہ فطرت، عقل اور وحی کو انسان کی ہدایت کے ذرائع میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والله سبحانه تفضل على بني آدم بأمرين هما أصل السعادة: أحدهما: أن كل مولود يولد على الفطرة... الثاني: أن الله تعالى هدى الناس هداية عامة، بما جعل فيهم من العقل، وبما أنزل إليهم من الكتب، وأرسل إليهم من الرسل.(مجموع الفتاویٰ ۲۰۵/۸)

”اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انسان کو دو چیزیں عنایت کی ہیں جو انسان کی سعادت کی بنیاد ہیں: ایک یہ کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور دوسری یہ کہ اللہ نے انسانوں کو عقل عطا کر کے اور کتابیں نازل کر کے اور اپنے رسول بھیج کر ان کی ہدایت عامہ کا بھی انتظام فرمایا ہے۔“

ابن تیمیہ سچائی، امانت، صلۂ رحمی اور عدل وانصاف کی محبت جیسے اخلاقی تصورات کو فطرت میں شمار کرتے ہیں[۳] اور لکھتے ہیں کہ انبیا کو انسان کی فطرت کی تائید اور تکمیل کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے اور شریعت، فطرت ہی کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے:

ولهذا كانت الرسل إنما تأتي بتذكير الفطرة ما هو معلوم لها وتقويته وإمداده ونفي المغير للفطرة. فالرسل بعثوا بتقرير الفطرة وتكميلها لا بتغيير الفطرة وتحويلها. والكمال يحصل بالفطرة المكملة بالشرعة المنزلة.(مجموع الفتاویٰ ۳۴۸/۱۶)

”اسی لیے پیغمبر فطرت کو انھی چیزوں کی یاددہانی کراتے ہیں جو اسے معلوم ہوتی ہیں اور ان کی تقویت وتائید کرتے ہوئے فطرت میں بگاڑ پیدا کرنے والی چیزوں کی نفی کرتے ہیں۔یعنی رسولوں کی بعثت فطرت کی تائید وتاکید اور اس کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے، نہ کہ فطرت کو تبدیل کرنے یا بگاڑنے کے لیے۔ انسان کو کمال اسی فطرت سے حاصل ہوتا ہے جس کی تکمیل اللہ کی نازل کردہ شریعت سے کی گئی ہو۔“

۳۔ مجموع الفتاویٰ ۱۲۱/۲۰۔ الرد علی المنطقیین ۴۲۳۔

ابن القیم نے اس نکتے کو مزید وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

الفطرة مركوز فيها معرفة الله ومحبته والإخلاص له والإقرار بشرعه وإيثاره على غيره، فهي تعرف ذلك وتشعر به مجملاً ومفصلاً بعض التفصيل، فجاءت الرسل تذكرها بذلك وتنبهها عليه وتفصله لها وتبينه، وتعرفها الأسباب المعارضة لموجب الفطرة المانعة من اقتفائها أثرها، وهكذا شأن الشرائع التي جاءت بها الرسل، فإنها أمر بمعروف ونهي عن منكر، وإباحة طيب وتحريم خبيث، وأمر بعدل ونهي عن ظلم، وهذا كله مركوز في الفطرة وكمال تفصيله وتبيينه موقوف على الرسل.

(شفاء العلیل ۵۱۳)

”فطرت میں اللہ کی معرفت، اس کی محبت اور اخلاص، اس کی شریعت کا اقرار اور غیر شریعت پر اس کو ترجیح دینے کا جذبہ، یہ سب چیزیں ودیعت شدہ ہیں۔ فطرت ان کو پہچانتی ہے اور ان کا اجمالی اور کسی قدر تفصیلی شعور بھی رکھتی ہے۔ پیغمبروں نے آکر انھی چیزوں کی یاددہانی کرائی، ان پر متنبہ کیا اور ان کی تفصیل و توضیح کی ہے، نیز ان اسباب کی پہچان کرائی ہے جو فطرت کے تقاضوں میں مانع بنتے ہیں اور فطرت کو ظہور پذیر ہونے سے روک دیتے ہیں۔ انبیا جو شریعتیں لے کر آئے، ان کا بھی یہی معاملہ ہے۔ وہ معروفات کا حکم دیتی، منکرات سے روکتی، پاکیزہ چیزوں کو مباح اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتی، عدل کا حکم دیتی اور ظلم سے منع کرتی ہیں۔ یہ سب چیزیں فطرت میں پہلے سے موجود ہیں، البتہ ان کی پوری تفصیل اور ان کی تشریح و توضیح کرنا رسولوں پر موقوف ہے۔“

فطری ہدایت اور انبیا کی تعلیم و دعوت کے باہمی تعلق کے حوالے سے کچھ مزید پہلوؤں کی وضاحت ”ایمانیات“ اور ”اخلاقیات“ کے مباحث میں متعلقہ مقامات پر کی جائے گی۔

دین کا تنہا ماخذ

”اِس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ دین کا تنہا ماخذ اِس زمین پر اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے۔ یہ صرف اُنھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو اُن کے پروردگار کی ہدایت میسر ہو سکتی اور یہ صرف اُنھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے وہ

جس چیز کو دین قرار دیں، وہی اب رہتی دنیا تک دین حق قرار پائے۔" (میزان ۱۳)

دین کی اس تعریف میں دو نکتے بنیادی ہیں: پہلا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا کا آخری پیغمبر ہونا اور دوسرا، قیامت تک کے لیے دین کا تنہا ماخذ ہونا۔ ان دونوں نکتوں کے بعض اہم مضمرات ہیں جو پیش نظر ہونے چاہییں۔

خدا کا آخری پیغمبر ہونے کا نکتہ دو اہم مضمرات کو متضمن ہے:

ایک یہ کہ آپ کے بعد نبوت و رسالت اور وحی و الہام کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور آپ کے بیان کردہ دین و شریعت کو ہی قیامت تک خدا کے حتمی اور آخری فرمان واجب الاذعان کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نکتے کی مزید تفصیل "ایمانیات" کے باب میں "ختم نبوت" کے عنوان کے تحت زیر بحث آئے گی۔

دوسرا اہم مضمر یہ ہے کہ آپ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت انسانوں کو پہلی مرتبہ نہیں، بلکہ آخری مرتبہ دی گئی ہے، یعنی آپ نے ہدایت الٰہی کے مشمولات تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک نئی دریافت کے طور پر پیش نہیں کیے، بلکہ آپ کی بعثت، سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی کے طور پر اور انبیا کے جاری کردہ پورے سلسلۂ ہدایت کے تاریخی پس منظر میں ہوئی ہے۔ اس نکتے کی مزید تفصیل مصنف نے "مبادی تدبر قرآن" کے تحت "دین کی آخری کتاب" کے زیر عنوان بیان کی ہے اور واضح کیا ہے کہ قرآن مجید جن دینی مقدمات کو پہلے سے موجود اور مخاطبین کے لیے معلوم و معروف تصور کر کے اپنی دعوت پیش کرتا ہے، وہ تین ہیں: ۱۔ فطرت کے حقائق، ۲۔ دین ابراہیمی کی روایت، اور ۳۔ نبیوں کے صحائف۔ ان میں سے دین ابراہیمی کی روایت قرآن مجید کی دعوت اور خطاب میں ضمنی و اضافی طور پر زیر بحث آتی ہے، جب کہ اس کے عملی احیا اور تجدید کا عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے انجام پایا ہے۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی دین کے فہم میں دینی روایت کے اس پورے تاریخی پس منظر کو ملحوظ رکھنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

ماخذ دین کے حوالے سے مصنف کی یہ تعبیر کہ وہ تنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، دینی روایت میں معروف تعبیر سے قدرے مختلف ہے، تاہم بنیادی نقطۂ نظر میں مصنف کا موقف دینی روایت کے معروف موقف سے ہم آہنگ ہے۔ روایتی تعبیر میں اس بات کو عموماً یوں بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کے علاوہ سنت بھی تشریع کا ماخذ ہے۔ مصنف نے اس کی جگہ یہ تعبیر اختیار کی ہے کہ دراصل امت کے لیے دین کا ماخذ تنہا پیغمبر کی ذات ہے، کیونکہ آپ کی وساطت کے بغیر ہدایت الٰہی کے کسی بھی جزو، یہاں تک کہ اللہ کی کتاب تک رسائی یا اس پر ایمان کی بھی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اصلاً و اساساً اور براہ راست قرآن

پر ایمان نہیں لاتا، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتا ہے، جب کہ قرآن کو خدا کا کلام ماننا اس کے بعد، آپ کی رسالت پر ایمان کے ایک لازمی تقاضے کے طور پر ضروری ٹھیرتا ہے۔

اس پہلو سے ''کتابوں پر ایمان'' کے زیر عنوان مصنف کا یہ اشارہ بھی بہت اہم ہے کہ ''انسان کی ہدایت کے لیے جس طرح نبی بھیجے گئے، اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ اپنی کتابیں بھی نازل کی ہیں۔ یہ کتابیں اِس لیے نازل کی گئیں کہ خدا کی ہدایت لکھی ہوئی اور خود اُس کے الفاظ میں لوگوں کے پاس موجود رہے'' (میزان ۱۵۵)۔ یعنی ہدایت اور اتمام حجت کے باب میں خدا کے نمایندے کی حیثیت اصلاً انبیا کو حاصل ہے، جب کہ کتابیں ان کی تائید اور ان کے ذریعے سے دی جانے والی ہدایت کو محفوظ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں۔

مصنف کی اس تعبیر کا بنیادی مقصد جدید دور میں سامنے آنے والے بعض نظریات کی تردید اور ان کی غلطی کو واضح کرنا معلوم ہوتا ہے جن کا مدعا یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت صرف ایک پیغام رساں کی ہے جو اللہ کی طرف سے دیے جانے والے احکام کو لوگوں تک پہنچا دینے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تشریع کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا، جس کی پابندی اللہ کی طرف سے نازل کردہ احکام وہدایات کی طرح لازم ہو۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق سنت کی پیروی کا مطلب صرف یہ ہے کہ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے نازل کردہ احکام پر عمل کیا، اسی طرح امت بھی ان احکام پر، نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ متعین احکام پر، عمل کا اہتمام کرے۔ برصغیر میں اس نقطۂ نظر کے ایک معروف نمایندہ ڈاکٹر عبد الودود نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

> ''رہا یہ سوال کہ آیا میں سنت کو قرآن کے ساتھ ماخذ قانون مانتا ہوں یا نہیں؟ میرا جواب نفی میں ہے۔... بے شک حضور نے حاکم اعلیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی، لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا اور جو کچھ حضور نے عملاً کیا، اس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی، میرے لیے ناقابل فہم ہے..... 'ما انزل اللہ' کے مطابق تربیت، جماعت بندی، ریاست کا قیام، مشاورت، قضا، غزوات، یہ سارے کام امت کرے تو یہ سنت رسول اللہ ہی کی پیروی ہے۔ حضور نے بھی اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق 'ما انزل اللہ' پر عمل کرتے ہوئے معاشرے کی تشکیل کی۔ اور سنت رسول اللہ کی پیروی یہ ہے کہ ہر زمانے کی امت زمانے کے تقاضوں کے مطابق 'ما انزل اللہ' پر عمل کرتے ہوئے معاشرے کی تشکیل کرے۔'' (سید ابو الاعلیٰ مودودی، سنت کی آئینی حیثیت ۶۰، ۶۱)

اس نقطۂ نظر کی تردید مصنف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ''دین کا تنہا ماخذ'' قرار دے کر کی ہے، جس کا مدعا یہ ہے کہ کسی انسان کو پیغمبر ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس کا دین لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہے اور وہ جو چیز بھی اس اعلان کے ساتھ لوگوں کو دے گا کہ یہ خدا کا دین ہے، اسے ماننا لازم ہو گا۔ وہ خدا کے نازل کردہ کلام کے طور پر کوئی چیز پیش کرے یا اس کے علاوہ کوئی حکم یا ہدایت، یہ کہہ کر لوگوں کو دے کہ یہ خدا کا دین ہے، ہر صورت میں اس کے پیش کردہ دین کو ماننا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ بالفرض، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت کا اعلان کرنے کے بعد کلام الٰہی کے طور پر قرآن کو سرے سے پیش ہی نہ کرتے اور اس کے بجائے محض یہ فرماتے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور اس حیثیت سے تمھیں فلاں بات کا حکم دیتا اور فلاں بات سے روکتا ہوں تو بھی اس کی اطاعت بدیہی طور پر لازم ہوتی، کیونکہ اس کے بغیر آپ کو ''رسول'' ماننے کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا۔

''مبادی تدبر سنت'' کے زیر عنوان مصنف نے ماخذ دین کے طور پر سنت کی مستقل بالذات حیثیت کو مزید یوں واضح کیا ہے کہ جس طرح قرآن دین کے بہت سے مستقل بالذات احکام بیان کرتا اور سنت، ان احکام کے کچھ فروع اور تفصیلات کو واضح کرتی ہے، اسی طرح سنت بھی ایسے مستقل بالذات احکام بیان کرتی ہے جن کی ابتدا قرآن سے نہیں ہوئی، اور پھر قرآن ان کے بعض مزید پہلوؤں کو واضح کر دیتا ہے۔ چنانچہ جیسے یہ امکان ہے کہ کسی حکم کو اصلاً وابتداءً قرآن نے بیان کیا ہو اور سنت نے اس کی مختلف فروع کی وضاحت کی ہو، اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس مسئلے میں تشریع کی ابتدا سنت سے ہوئی ہو اور اسی نے اس باب میں بنیادی وتاصیلی ماخذ کا کردار ادا کیا ہو، جب کہ قرآن نے اس کو ایک ثابت شدہ حکم مان کر اس پر بعض مزید احکام کا اضافہ کیا ہو۔ گویا تشریع کی ابتدا کرنے میں قرآن اور سنت، دونوں مساوی درجے کے ماخذ ہیں اور دونوں اپنی مستقل حیثیت میں دین کے تاصیلی احکام بھی بیان کر سکتے ہیں اور پہلے سے ثابت شدہ احکام میں اضافات بھی شامل کر سکتے ہیں۔

اخبار آحاد کی دینی اہمیت پر کلام کرتے ہوئے مصنف نے اس نکتے کو مزید یوں واضح کیا ہے کہ اگرچہ وہ قرآن و سنت ہی میں محصور دین کی تفہیم و تبیین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بیان ہیں اور ان کی تبلیغ و حفاظت کا اہتمام کرنے کے بجائے آپ نے اسے دیکھنے اور سننے والوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا کہ جن چیزوں کو اُن کی نوعیت کے لحاظ سے ضروری سمجھیں، آگے پہنچائیں اور جن کو نہ سمجھیں، نہ پہنچائیں، تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی قول وفعل یا تصویب کی نسبت پر اطمینان ہو جانے کے بعد اس کو قبول کرنا بھی لازم ہو جاتا

ہے اور اس سے انحراف کسی صاحب ایمان کے لیے جائز نہیں رہتا۔ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۶۵ کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

''اِس دائرے کے اندر، البتہ حدیث کی حجت ہر اُس شخص پر قائم ہو جاتی ہے جو اِس کی صحت پر مطمئن ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل یا تقریر و تصویب کی حیثیت سے اِسے قبول کر لیتا ہے۔ اِس سے انحراف پھر اُس کے لیے جائز نہیں رہتا، بلکہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ کا کوئی حکم یا فیصلہ اگر اِس میں بیان کیا گیا ہے تو اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔'' (میزان ۱۵)

دین کا تواتر

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے:

۱۔ قرآن مجید

۲۔ سنت...

دین اصلاً اِنھی دو صورتوں میں ہے۔ اِن کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اُسے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔''

(میزان ۱۳، ۱۵)

مصنف نے دین کو قرآن اور سنت میں محصور اور ان دونوں کے ثبوت کو اجماع اور تواتر پر مبنی قرار دیا ہے۔ سنت کے مشمولات کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے عبادات، معاشرت، خورونوش اور رسوم و آداب سے متعلق درج ذیل اساسی احکام و شرائع کا ذکر کیا ہے، جو امت کے اجتماعی تعامل کا حصہ ہیں:

عبادات میں: ۱۔ نماز۔ ۲۔ زکوٰۃ اور صدقۂ فطر۔ ۳۔ روزہ و اعتکاف۔ ۴۔ حج و عمرہ۔ ۵۔ قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں۔

معاشرت میں: ۱۔ نکاح و طلاق اور اُن کے متعلقات۔ ۲۔ حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب۔

خورونوش میں: ۱۔ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت۔ ۲۔ اپنا اور جانور کا 'رجس' دور کرنے کے لیے اللہ کا نام لے کر اُس کا تذکیہ۔

رسوم و آداب میں: ۱۔ اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ ۲۔ ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اُس کا جواب۔ ۳۔ چھینک آنے پر 'الحمد للّٰہ' اور اُس کے جواب میں 'یرحمك اللّٰہ'۔ ۴۔ مونچھیں پست

رکھنا۔ ۵۔ زیر ناف کے بال کاٹنا۔ ۶۔ بغل کے بال صاف کرنا۔ ۷۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ ۸۔ لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ ۹۔ ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ ۱۰۔ استنجا۔ ۱۱۔ حیض و نفاس کے بعد غسل۔ ۱۲۔ غسل جنابت۔ ۱۳۔ میت کا غسل۔ ۱۴۔ تجہیز و تکفین۔ ۱۵۔ تدفین۔ ۱۶۔ عید الفطر۔ ۱۷۔ عید الاضحیٰ۔

گویا دین کے عملی احکام و شرائع کا پورا ڈھانچہ مصنف کے نزدیک سنت میں شامل ہے جو اجماع و تواتر سے ثابت ہے۔

مصنف نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ دین کا اجماع و تواتر پر مبنی، یعنی باعتبار ثبوت قطعی ہونا کیوں ضروری ہے۔ چنانچہ سورۂ فرقان (۲۵) کی آیت ۱ 'لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا' کی تفسیر میں مصنف نے ''البیان'' میں لکھا ہے:

''سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۹ میں مزید وضاحت فرمائی ہے کہ قرآن کی دعوت آنے والے تمام زمانوں کے لیے بھی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: 'اُوۡحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ' (یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے کہ اِس کے ذریعے سے میں تمھیں انذار کروں اور اُن کو بھی جنھیں یہ پہنچے)۔ قرآن کی یہ حیثیت لازماً تقاضا کرتی ہے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے بھی یہ اپنے ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے اُسی طرح قطعی رہے، جس طرح اپنے اولین مخاطبین کے لیے تھا۔ خدا کی عنایت ہے کہ ایسا ہی ہے اور اُس کی یہ کتاب اِسی قطعیت کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے۔'' (۳/ ۴۶۴)

یہی استدلال مصنف نے سنت کے قطعی الثبوت ہونے کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ ''مبادی تدبر سنت'' کی فصل میں سنت کی تعیین کے ساتویں اصول کے تحت مصنف نے لکھا ہے:

''سنت کی حیثیت دین میں مستقل بالذات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِسے پورے اہتمام، پوری حفاظت اور پوری قطعیت کے ساتھ انسانوں تک پہنچانے کے مکلف تھے۔ اخبار آحاد کی طرح اِسے لوگوں کے فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کہ وہ چاہیں تو اِسے آگے منتقل کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ لہٰذا قرآن ہی کی طرح سنت کا ماخذ بھی امت کا اجماع ہے اور وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے امت کو ملا ہے، اِسی طرح یہ اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے، اِس سے کم تر کسی ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی تفہیم و تبیین کی روایت تو بے شک، قبول کی جا سکتی ہے، لیکن قرآن و سنت کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتے۔'' (میزان ۶۲)

یہ نکتہ اکابر اہل علم نے بھی واضح کیا ہے کہ دین کے اساسی اور بنیادی احکام تواتر اور قطعیت کے ساتھ امت

کو منتقل ہوئے ہیں۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ تاریخی ثبوت کے پہلو سے مسلمانوں کے دین اور اہل کتاب کی دینی روایت کے باہمی امتیاز کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی دینی روایت میں اساسی دین ۱۔ قرآن مجید کے الفاظ، ۲۔ اس کی اساسی تعلیمات کے معنی و مفہوم اور ۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی صورت میں اجماع اور تواتر کے ساتھ منقول ہے اور تمام مسلمانوں کو اضطراراً معلوم ہے، یعنی وہ متواتر اور مجمع علیہ دین کے ثبوت میں کوئی شک وشبہ یا انکار نہیں کر سکتے۔ گویا مسلمانوں کا دین اپنے اساسی ڈھانچے کے لحاظ سے قطعیت کے ساتھ محفوظ ہے۔ لکھتے ہیں:

فكل ما أجمع المسلمون عليه من دينهم إجماعًا ظاهرًا معروفًا عندهم فهو منقول عن الرسول نقلاً متواترًا، بل معلومًا بالاضطرار من دينه، فإن الصلوات الخمس، والزكاة، وصيام شهر رمضان، وحج البيت العتيق، ووجوب العدل والصدق، وتحريم الشرك والفواحش والظلم، بل وتحريم الخمر والميسر والربا، وغير ذلك منقول عن النبي صلى الله عليه وسلم نقلاً متواترًا كنقل ألفاظ القرآن الدالة على ذلك. ومن هذا الباب عموم رسالته صلى الله عليه وسلم وأنه مبعوث إلى جميع الناس أهل الكتاب وغير أهل الكتاب، بل إلى الثقلين الإنس والجن وأنه كان يكفر اليهود والنصارى الذين لم يتبعوا ما أنزل الله عليه كما كان

”مسلمانوں کا اپنے دین کی جن تعلیمات پر واضح اور معروف اجماع ہے، وہ سب کی سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہیں، بلکہ ان کا آپ کے دین کا حصہ ہونا قطعی اور اضطراری طور پر معلوم ہے۔ مثلاً پانچ نمازیں، زکوٰۃ، رمضان کے روزے، بیت اللہ کا حج، عدل اور سچائی کا وجوب، شرک اور فواحش اور ظلم کی حرمت، اسی طرح شراب، جوے اور سود کی حرمت اور ان کے علاوہ دوسری باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح تواتر کے ساتھ منقول ہیں، جس طرح ان پر دلالت کرنے والے قرآن کے الفاظ متواتر ہیں۔ اسی نوعیت کی تعلیمات میں یہ بھی شامل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لیے رسول ہیں اور اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب، آپ سب انسانوں کی طرف، بلکہ انسانوں کے علاوہ جنوں کی طرف بھی مبعوث ہیں۔ اسی طرح یہ کہ جیسے آپ اہل کتاب کے علاوہ

يكفر غيرهم ممن لم يؤمن بذلك وأنه جاهدهم وأمر بجهادهم. فالمسلمون - عندهم منقولاً عن نبيهم نقلاً متواترًا -ثلاثة أمور: لفظ القرآن ومعانيه التي أجمع المسلمون عليها والسنة المتواترة وهي الحكمة التي أنزلها الله عليه غير القرآن. (الجواب الصحیح ۳/۱۰)

دوسرے لوگوں کو کافر قرار دیتے تھے جو آپ پر اتارے گئے دین پر ایمان نہ لائیں، اسی طرح یہود ونصاریٰ کی بھی تکفیر کرتے تھے اور ان کے خلاف بھی آپ نے جہاد کیا اور جہاد کرنے کا حکم دیا۔ پس مسلمانوں کے پاس اپنے نبی سے تواتر کے ساتھ نقل ہونے والی تین چیزیں موجود ہیں: قرآن کے الفاظ، قرآن کی وہ تعلیمات جن پر مسلمانوں کا اجماع ہے، اور سنت متواترہ جو دراصل اس حکمت سے عبارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر قرآن کے علاوہ نازل فرمائی۔"

مولانا مودودی اس نکتے کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ختم نبوت کا اعلان بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کیے ہوئے آخری رسول کی رہنمائی اور اس کے نقوش قدم کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری لے لی ہے تاکہ اس کی زندگی ہمیشہ انسان کی رہنمائی کرتی رہے اور اس کے بعد کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع جریدۂ عالم پر ان نقوش کو کیسا ثبت کیا ہے کہ آج کوئی طاقت انھیں مٹا نہیں سکتی۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ یہ وضو، یہ پنج وقتہ نماز، یہ اذان، یہ مساجد کی نماز باجماعت، یہ عیدین کی نمازیں، یہ حج کے مناسک، یہ بقر عید کی قربانی، یہ زکوٰۃ کی شرحیں، یہ ختنہ، یہ نکاح وطلاق ووراثت کے قاعدے، یہ حرام و حلال کے ضابطے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دوسرے بہت سے اصول اور طور طریقے جس روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کیے، اسی روز سے وہ مسلم معاشرے میں ٹھیک اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھ گئیں، اور پھر ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں مسلمان دنیا کے ہر گوشے میں نسلاً بعد نسلٍ ان کی اسی طرح پیروی کرتے چلے آ رہے ہیں جس طرح ان کی ایک نسل سے دوسری نسل قرآن لیتی چلی آ رہی ہے۔ ہماری تہذیب کا بنیادی ڈھانچہ رسول پاک کی جن سنتوں پر قائم ہے، ان کے صحیح ہونے کا ثبوت بعینہٖ وہی ہے جو قرآن پاک کے محفوظ ہونے کا ثبوت ہے۔" (سنت کی آئینی حیثیت ۱۳۰)

جہاں تک اخبار آحاد کا تعلق ہے تو ان میں منقول دینی احکام وہدایات کی نوعیت مصنف نے یہ متعین کی ہے کہ وہ قرآن و سنت میں محصور دین کی تفہیم و تبیین اور اِس پر عمل کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بیان ہے۔ اسی بات کو مصنف نے یوں تعبیر کیا ہے کہ اخبار آحاد سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ نہیں ہوتا، کیونکہ خبر واحد میں جس عقیدہ یا عمل کی تفہیم و تبیین کی جاتی ہے، وہ اپنی اصل میں قرآن یا سنت میں موجود ہوتا ہے۔ اس نکتے کی مزید تفصیل ''مبادی تدبر حدیث'' کے زیر عنوان بیان کی جائے گی۔

[باقی]

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۳۶)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت طلیب بن عمیر رضی اللہ عنہ

نام و نسب

قصی بن کلاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچویں جد تھے۔ عبد مناف (اصل نام: مغیرہ)، عبدالدار (اصل نام: عبداللہ)، عبدالعزیٰ اور عبد قصی (یا عبد) ان کے چار بیٹے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب عبد مناف سے، جب کہ حضرت طلیب بن عمیر کا عبد سے ملتا ہے۔ عبد بن قصی کے دو بیٹے وہب اور بجیر ہوئے۔ وہب بن عبد (یا وہب بن ابو کثیر بن عبد) حضرت طلیب کے دادا تھے۔ حضرت طلیب ہجرت سے بائیس سال قبل مکہ میں عمیر (یا عمرو: ابن اثیر) بن وہب کے ہاں پیدا ہوئے۔

ابو عدی حضرت طلیب بن عمیر کی کنیت اور قرشی، عبدی نسبت ہے۔ انھیں عبدری کہنا درست نہیں، کیونکہ یہ اسم منسوب عبدالدار بن قصی کی اولاد سے مخصوص ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی حضرت اروی بنت عبدالمطلب حضرت طلیب کی والدہ تھیں۔

ایمان و اسلام

حضرت طلیب بن عمیر کا شمار ایمان سے سرفراز ہونے والے اولیں مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اس وقت بیعت کی جب آپ دار ارقم میں تشریف رکھتے تھے۔

والدہ کا قبول اسلام

حضرت طلیب بن عمیر اسلام لانے کے بعد اپنی والدہ حضرت اروٰی کے پاس آئے اور کہا: میں نے خلوص دل سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر لی ہے۔ انھوں نے کہا: تمھارا ماموں زاد ہی حق رکھتا تھا کہ تم اس کو تقویت دیتے اور اس کا بازو بنتے۔ واللہ، کاش اگر ہم بھی مردوں کی طرح طاقت رکھتیں تو ضرور ان کی حفاظت اور ان کا دفاع کرتیں۔ حضرت طلیب نے عرض کیا: اماں، آپ کے اسلام قبول کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ آپ کے بھائی حمزہ تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا: میں اس انتظار میں ہوں کہ میری بہنیں کیا کرتی ہیں۔ حضرت طلیب نے عرض کیا: میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی نبوت کی شہادت دے دیں۔ بیٹے کی فریاد سن کر ماں کا دل پسیج گیا اور وہ بول اٹھیں: میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسول ہیں۔ ایمان لانے کے بعد حضرت اروٰی زبان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا پرچار کرتی رہیں اور اپنے بیٹے کو آپ کی نصرت کرنے اور آپ کے احکام بجا لانے پر ابھارتی رہیں (مستدرک حاکم، رقم ۵۰۴۷)۔

ان کے ایمان کی خبر سن کر ان کا سوتیلا بھائی ابولہب آیا اور کہا: تم نے عبد المطلب کا دین چھوڑ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کر لی ہے؟ حضرت اروٰی نے کہا: تم بھی اپنے بھتیجے کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور اس کا دفاع کرو۔ اگر اس کا دین غالب آ گیا تو تم اسے اپنا لینا یا اپنے دین پر قائم رہنا۔ ابولہب نے کہا: ہم ایک نئے دین کے لیے تمام عرب سے نہیں لڑ سکتے (مستدرک حاکم، رقم ۶۸۶۸)۔ حضرت اروٰی اپنی استطاعت کے مطابق نصرت دین کرتی رہیں اور اپنے بیٹے کو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کا دفاع کرنے کی ہدایت کرتی رہیں۔

قریش کا تشدد اور حضرت طلیب کا جواب

۶ / اگست ۶۱۰ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونا شروع ہوئی۔ حضرت خدیجہ، حضرت ابوبکر، حضرت زید بن حارثہ اور حضرت علی فوراً آپ پر ایمان لے آئے۔ ’یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَاَنْذِرْ‘، ”اے چادر

لپیٹے رکھنے والے، اٹھ اور لوگوں کو خبر دار کر" (المدثر ۷۴: ۱-۲) کا حکم آیا تو آپ نے در پردہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کی، یہ سلسلہ تین سال جاری رہا۔ آپ کا پیغام مکہ میں پھیلنے لگا تو کفار کی طرف سے ایذاؤں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نبوت کے چوتھے سال ۶۱۳ء میں اللہ کا فرمان 'فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ، اِنَّا كَفَيۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَ'، "سو کھل کر بیان کیجیے جو آپ کو حکم ہوا اور مشرکوں سے منہ موڑ لیجیے۔ ہم ٹھٹھا کرنے والوں سے نمٹنے کے لیے آپ کی طرف سے کافی ہیں" (الحجر ۱۵: ۹۴-۹۵) نازل ہونے کے بعد علانیہ دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔ تب کفار قریش کے جور و ستم میں تیزی آ گئی۔

غریب و نادار اہل ایمان مشرکوں کا خاص نشانہ تھے، تاہم وہ موقع ملنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کبار صحابہ کو بھی ایذا دینے سے باز نہ آتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی ایام میں کہ ابھی پانچ نمازیں فرض نہ ہوئی تھیں، عصر کا وقت ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ مکہ کی وادیوں میں بکھر جاتے اور ایک ایک، دو دو کر کے نماز ادا کرتے۔ حضرت طلیب بن عمیر اور حضرت حاطب بن عمرو حرم کے جنوب میں واقع اجیاد اصغر (موجودہ اجیاد السد) کی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ دو مشرک ابن اصدا (ابن الاصیدی: مستدرک حاکم، رقم ۶۸۶۸) اور ابن غیطلہ، یعنی حارث بن قیس (ابن القبطیہ: مستدرک حاکم، رقم ۶۸۶۸) ان پر ٹوٹ پڑے اور ان پر پتھر برسائے، حتیٰ کہ دونوں کو وہاں سے جانا پڑا (انساب الاشراف ۱/ ۱۳۳ الصلوات الخمس)۔ ان حالات نے حضرت طلیب میں رد عمل جنم دیا اور انھوں نے مشرکوں کے ظلم و ستم کا جواب دینا شروع کر دیا۔ چنانچہ متعدد ملتے جلتے واقعات ان سے منسوب کیے گئے ہیں۔ بنو سہم کا کٹر مشرک عوف بن صبرہ (: ابن حجر۔ ابو عوف بن صبیرہ: مصعب زبیری، ابن حزم) آپ کی شان میں ناروا الفاظ استعمال کر رہا تھا کہ حضرت طلیب نے اونٹ کی ہڈی مار کر اسے زخمی کر دیا۔ دوسری روایت میں اس مشرک کا نام ابو اہاب بن عزیز دارمی بتایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت طلیب کا یہ عمل اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا، تاہم جب حضرت سعد بن ابی وقاص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی مار کر مشرک عبد اللہ بن خطل کو زخمی کر دیا تو اسے بھی شرک و اسلام کی کش مکش میں بہنے والا پہلا خون قرار دیا گیا۔

مسلمان کسی درے میں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو جہل، عقبہ بن ابی معیط اور دوسرے سرکشوں نے ان پر حملہ کر دیا اور گالی گلوچ کی۔ صحابہ نے ایمان و اسلام کا اعلان کرتے ہوئے اپنا دفاع کیا۔ حضرت طلیب بن عمیر آگے بڑھے اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی مار کر ابو جہل کو زخمی کر دیا۔ مشرکوں نے انھیں باندھ دیا تو ابو لہب نے چھڑایا اور حضرت اروی کو خبر کی (الطبقات الکبریٰ، رقم ۴۰۹۵۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۸۶۸۔

انساب الاشراف ۴/ ۴۲۴ بنات عبد المطلب)۔

ایک کٹر مشرک اور دشمن رسول عقبہ بن ابی معیط نے ٹوکرے میں پاخانہ ڈال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے دروازے پر بکھیر دیا۔ حضرت طلیب نے دیکھا تو ٹوکرا اٹھا کر عقبہ کے سر پر دے مارا۔ عقبہ انھیں پکڑ کر ان کی والدہ کے پاس لے گیا (انساب الاشراف ۱/ ۱۶۶ امر عقبہ بن ابی معیط)۔

ان سب واقعات میں لوگوں نے حضرت طلیب کی والدہ سے شکایت کی کہ آپ کے بیٹے نے اپنے آپ کو محمد کی ڈھال بنالیا ہے تو انھوں نے جواب دیا: ہم سے زیادہ کون ان کا قریبی ہو سکتا ہے؟ ہمارے جان و مال ان کے لیے حاضر ہیں۔ طلیب کی زندگی کا بہترین دن وہی ہے جس میں اس نے اپنے ماموں زاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا، جو اللہ کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں۔ انھوں نے یہ شعر بھی پڑھا:

إن طليبًا نصر ابن خاله

واساه في ذي ذمه و ماله

”بلاشبہ، طلیب نے اپنے ماموں زاد کی مدد کی اور اس سے ہم دردی کی کہ اس پر مذمت نہ آئے اور اس کا مالی نقصان نہ ہو۔“

ہجرت حبشہ

قریش کی ایذا رسانی بڑھتی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ سمندر پار ملک حبشہ (Abyssinia، حالیہ Ethiopia) ہجرت کر جائیں، جہاں ظلم نہیں ہوتا۔ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ حضرت طلیب بن عمیر ہجرت ثانیہ میں حبشہ گئے (الطبقات الکبریٰ، رقم ۳۷۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۰۴۶)۔

مکہ کو مراجعت

ہجرت کے دو ماہ بعد، شوال ۵/ نبوی میں قریش کے قبول اسلام کی افواہ حبشہ پہنچی تو مہاجرین کی بڑی تعداد نے یہ کہہ کر مکہ کا رخ کیا کہ ہمارے کنبے ہی ہمیں زیادہ محبوب ہیں۔ ابن ہشام کہتے ہیں: مکہ پہنچنے سے پہلے ان کو معلوم ہوا کہ ان کی سنی ہوئی خبر جھوٹی تھی تو مکہ میں وہی اصحاب داخل ہوئے جنھیں کسی کی پناہ ملی یا وہ چھپ چھپا کر رہے۔ حضرت طلیب بن عمیر ان تینتیس اصحاب اور چھ صحابیات (ابن سعد: تینتیس صحابہ اور آٹھ صحابیات) میں شامل تھے جنھوں نے مکہ میں قیام کرنے کو ترجیح دی۔ حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت ابو سلمہ بن

عبدالاسد کے برعکس انھیں کسی مشرک کی پناہ نہ ملی۔ ابن اسحٰق کا کہنا ہے: واپس آنے والے مہاجرین کو حبشہ لوٹنا دشوار محسوس ہوا تو ہر ایک اہل مکہ میں سے کسی کی پناہ ڈھونڈ کر مکہ میں داخل ہو گیا۔

ہجرت مدینہ

مہاجرین حبشہ کے مکہ لوٹنے کے بعد مشرکین کے ظلم و ستم میں اضافہ ہو گیا۔ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو آپ نے ارشاد فرمایا: مجھے تمھارا دار ہجرت دکھا دیا گیا ہے، میں نے خواب میں ایک کھجوروں والی نرم زمین شور دیکھی جو دو سیاہ سنگلاخ خطوں کے مابین واقع ہے (بخاری، رقم ۲۲۹۷۔ احمد، رقم ۲۵۶۲۶۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۲۶۲، ۵۷۰۶۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۷۳۷۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۲۹۶۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۲۷۷)۔ میں نے دیکھا کہ اس نخلستان کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں آیا کہ یہ یمامہ یا ہجر کا علاقہ ہو گا، لیکن یہ یثرب نکلا (بخاری، مناقب الانصار ۴۵۔ مسلم، رقم ۵۹۹۷۔ ابن ماجہ، رقم ۳۹۲۱۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۷۶۰۳)۔ آپ کے فرمان کے بعد صحابہ ایک ایک کر کے اور ٹولیوں کی صورت میں مدینہ جانے لگے۔ حضرت طلیب بن عمیر نے بھی اپنی دوسری ہجرت کی تیاری کی اور مدینہ چلے آئے۔ مدینہ میں وہ حضرت عبداللہ بن سلمہ عجلانی کے مہمان ہوئے۔ حضرت عبیدہ بن حارث، حضرت طفیل بن حارث، حضرت حصین بن حارث، حضرت مسطح بن اثاثہ، حضرت سویبط بن سعد اور حضرت خباب بن ارت نے بھی ان کے ساتھ قیام کیا۔ حضرت عبیدہ، حضرت طفیل، حضرت حصین، تینوں بھائیوں اور ان کے بھتیجے حضرت مسطح کا اکٹھے سفر ہجرت کرنا بیان ہوا ہے۔ ممکن ہے، حضرت طلیب نے بھی انھی اصحاب کے ہم راہ اللہ کی راہ میں یہ سفر کیا ہو۔

مہاجرین و انصار کے مابین مواخات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف آوری کے پانچ ماہ بعد جب مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہو چکی، حضرت انس بن مالک کے گھر پینتالیس مہاجرین کی پینتالیس انصار کے ساتھ مواخات قائم فرمائی۔ آپ نے حضرت منذر بن عمرو ساعدی کو حضرت طلیب کا انصاری بھائی قرار دیا۔ قبیلۂ خزرج کے خاندان ساعدہ سے تعلق رکھنے والے حضرت منذر نے عقبۂ ثانیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ آپ نے انھیں اور حضرت سعد بن عبادہ کو بنو ساعدہ کا نقیب مقرر فرمایا۔ ابن اسحٰق نے حضرت منذر بن عمرو ساعدی کی مواخات حضرت ابوذر غفاری سے بتائی ہے۔ واقدی کہتے ہیں: حضرت ابوذر بدر، احد اور خندق کی جنگیں ہونے

کے بعد مدینہ آئے، وہ حضرت منذر کے انصاری بھائی کیسے ہو سکتے ہیں؟

غزوات

حضرت طلیب بن نصیر بدری صحابی تھے۔ مکہ میں جبر و ستم کا شکار ہونے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علانیہ نصرت کرنے کے بعد مدینہ آئے تو معرکۂ فرقان غزوۂ بدر میں بھرپور شرکت کی۔ ابن اسحٰق، ابو معشر اور موسیٰ بن عقبہ نے انھیں شرکاے بدر میں شمار نہیں کیا۔ باقی غزوات میں ان کی شرکت کا ذکر نہیں ملتا۔

وقت شہادت

حضرت طلیب بن عمیر نے جمادی الاولیٰ ۱۳ھ میں شام کے مقام اجنادین میں اسلامی اور رومی فوجوں کے مابین لڑی جانے والی جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔ ان کی عمر پینتیس برس ہوئی۔ شاذ روایت کے مطابق ان کی شہادت جنگ یرموک میں ہوئی۔

جنگ اجنادین

جنگ اجنادین یا فتح قیساریہ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ (۶/ جولائی ۶۳۴ء۔ طبری: ۱۵ھ، ۶۳۶ء) میں اسرائیل و فلسطین کے مقامات رملہ اور بیت غوفرین یا بیت جبرون (Beit Gurvin) کے درمیان ایک جگہ لڑی گئی، جو بعد میں اجنادین کے نام سے مشہور ہوئی۔ ابتدائی جھڑپوں میں حضرت معاویہ بن ابوسفیان نے رومی بازنطینی قوتوں کے خلاف اسلامی فوج کی قیادت کی، جب کہ فیصلہ کن معرکہ میں حضرت عمرو بن العاص سپہ سالار تھے۔ قیصر روم کے بھائی تھیوڈور (Theodore) کی سربراہی میں ساٹھ ہزار (نوے ہزار: واقدی) کے رومی لشکر نے بیس ہزار (تینتیس ہزار: واقدی) کی اسلامی فوج سے شکست کھائی۔ اس جنگ میں پچاس ہزار رومی جہنم واصل ہوئے، جب کہ مسلم شہدا کی تعداد پانچ سو پچھتر رہی، جن میں حضرت طلیب بن عمیر، حضرت عمرو بن سعید، حضرت سلمہ بن ہشام، حضرت ابان بن سعید، حضرت جندب بن عمرو، حضرت تمیم بن حارث، حضرت قیس بن حارث، حضرت حارث بن اوس، حضرت ضرار بن ازور اور حضرت ہشام بن العاص شامل تھے۔

زواج و اولاد

حضرت طلیب بن عمیر کی اہلیہ حضرت زینب کا تعلق بنوطے سے تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ عبد بن قصی کی نسل کا خاتمہ ہوا تو حضرت عبداللہ بن عباس کے پوتے عبدالصمد بن علی اور عروہ بن زبیر کے بیٹے عبیداللہ ان

کے آخری فرد کے وارث بنے۔

روایت حدیث

حضرت طلیب سے کوئی روایت مروی نہیں۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم و الملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، انساب الاشراف (بلاذری)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)۔

حضرت عمرہ بنت سعدی رضی اللہ عنہا

حسب نسب

حضرت عمرہ (یا عمیرہ) بنت سعدی قریش کی شاخ بنو عامر بن لؤی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد کا نام عمرو بن وقدان تھا، ان کی دودھ پلائی بنو سعد بن بکر میں ہوئی، اس لیے سعدی کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ حضرت عمرہ کے دادا کا نام وقدان بن عبد شمس تھا، عبد ود بن نصر چوتھے، مالک بن حسل چھٹے اور ابو القبیلہ عامر بن لؤی آٹھویں جد تھے۔ نویں پیڑھی لؤی بن غالب پر ان کا نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرے سے جا ملتا ہے، لؤی آپ کے بھی نویں جد تھے۔ حضرت عمرہ کے ایک ہی بھائی حضرت عبداللہ بن سعدی کا ذکر ملتا ہے، جو اپنی نسبت ابن الساعدی سے مشہور ہیں۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے انھیں سواریوں کے پاس چھوڑ دیا گیا، لیکن وہ خود آپ کی خدمت میں پیش ہو گئے اور آپ سے استفسار بھی کیا (نسائی، رقم ۴۱۷۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۴۸۶۶)۔ حضرت عمر نے انھیں زکوٰۃ کا عامل مقرر کیا اور ان کے انکار کے باوجود ان کے منصب کی اجرت دی (مسلم، رقم ۲۴۰۸۔ ابوداؤد، رقم ۲۹۴۴)۔ ان کا انتقال عہد فاروقی میں ہوا۔ دوسری روایت کے مطابق وہ ۵۷ھ میں عہد معاویہ میں فوت ہوئے (واقدی، بلاذری)۔

حضرت عمرہ بنت سعدی کا بیاہ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ کے بھائی حضرت مالک بن زمعہ سے ہوا۔

حضرت مالک کے دادا قیس بن عبد شمس حضرت عمرہ بنت سعدی کے دادا وقدان بن عبد شمس کے سگے بھائی تھے۔ابن اسحٰق اور ابن ہشام نے حضرت عمرہ کے شوہر کا نام مالک بن ربیعہ بن قیس بن عبد شمس درج کیا ہے۔ کتب صحابہ میں یہ نسب رکھنے والے کوئی صحابی نہیں پائے جاتے، اگرچہ ابن حجر نے اس نام کا عنوان قائم کر کے اس کی تفصیل مالک بن زمعہ بن قیس بن عبد شمس کے تحت بیان کی اور زبیر بن بکار کے حوالے سے اسے درست قرار دیا ہے۔

قبول اسلام

حضرت عمرہ بنت سعدی اور ان کے شوہر حضرت مالک بن زمعہ ابتداے اسلام میں نعمت ایمان سے مالا مال ہوئے۔

ہجرت حبشہ

بعثت کے بعد تین سال تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کار نبوت مخفی طور پر سر انجام دیتے رہے۔ پھر اللہ کے فرمان 'فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ'، ''(اے نبی)، آپ کو جو حکم نبوت ملا ہے، اسے ہانکے پکارے کہہ دیجیے'' (الحجر ۱۵: ۹۴) کی تعمیل میں قرآن مجید جہراً سنانے لگے۔ نوجوانوں، غریبوں اور غلاموں کی اکثریت نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو مشرکین مکہ نے نومسلموں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے۔ یہ سلسلہ عروج کو پہنچ گیا تو ۵؍ نبوی میں آپ نے اپنے صحابہ کو ارشاد فرمایا: ''تم اللہ کی سر زمین میں بکھر جاؤ۔ حبشہ کی سر زمین میں ایسا بادشاہ حکمران ہے جس کی سلطنت میں ظلم نہیں کیا جاتا۔ تم وہاں رہنا جب تک اللہ تمھاری سختیوں سے کشادگی کی راہ نکال نہیں دیتا۔'' چنانچہ رجب ۵؍ نبوی میں سولہ اہل ایمان کشتی کے ذریعے سے حبشہ روانہ ہوئے۔

شوال ۵؍ نبوی میں قریش کے قبول اسلام کی افواہ حبشہ میں موجود مسلمانوں تک پہنچی تو ان میں سے کچھ یہ کہہ کر مکہ کی طرف روانہ ہو گئے کہ ہمارے کنبے ہی ہمیں زیادہ محبوب ہیں۔ یہ مکہ میں داخل ہوئے اور جب قوم کی اذیت رسانی میں تیزی آ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بار دگر حبشہ جانے کی اجازت دے دی۔ ان کے ساتھ کئی دیگر مسلمان بھی جانے کو تیار ہو گئے۔ اس طرح مہاجرین کی کل تعداد تراسی مرد اور انیس عورتیں ہو گئی۔ حضرت مالک بن زمعہ اور ان کی اہلیہ حضرت عمرہ (: ابن ہشام، عمیرہ: ابن سعد) بنت سعدی بھی ان میں شامل تھے۔ دونوں حضرت جعفر بن ابوطالب کی قیادت میں حبشہ گئے۔ بنو عامر بن لؤی کے دیگر سات

اصحاب اور دو صحابیات نے ان کے ہم راہ سفر ہجرت کیا۔

حبشہ سے مدینہ کی طرف

حضرت عمرہ بنت سعدی ۷ھ میں اپنے شوہر حضرت مالک بن زمعہ کے ساتھ، حضرت جعفر بن ابو طالب کی قیادت میں، نجاشی کی فراہم کردہ کشتیوں پر مدینہ پہنچیں۔

ابن اسحٰق نے حضرت جعفر بن ابو طالب کے ہمراہ سمندر کا سفر کر کے 'بولا' کے ساحل پر پہنچنے والے صحابہ میں قبیلۂ بنو عامر بن لؤی کے صرف تین افراد کی شمولیت کا ذکر کیا ہے: حضرت ابو حاطب بن عمرو، حضرت مالک اور ان کی اہلیہ حضرت عمرہ بنت سعدی۔ اس فہرست میں انھوں نے حضرت مالک بن زمعہ کے بجاے مالک بن ربیعہ بن قیس بن عبد شمس کا نام درج کیا، حالاں کہ وہ خود اس سے قبل حبشہ جانے والے مہاجرین کی فہرست بیان کرتے ہوئے مالک بن زمعہ لکھ چکے تھے۔ ابن ہشام کی ''السیرۃ النبویۃ'' کے پرانے نسخوں میں حبشہ جانے اور واپس آنے والے اصحاب، دونوں فہرستوں میں مالک بن ربیعہ لکھا ہے، جب کہ نئے نسخوں میں حبشہ جانے والے صحابہ کی فہرست میں مالک بن زمعہ کی تبدیلی کر دی گئی ہے۔

اولاد

حضرت عمرہ بنت سعدی کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن اسحٰق)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)۔

علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی

ترتیب و تعلیق: ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حدیث کذبات ثلاثہ کی تحقیق

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

[یہ موضوع اگرچہ پرانا ہو چکا ہے، تاہم ایک نئی تحقیق اِس مضمون میں پیش کی جا رہی ہے، جس کی وجہ سے اس پر بحث کا جواز بنتا ہے۔ قرآن کریم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملت ابراہیم کا بانی قرار دیتا ہے (دعوت محمدی جس کی تجدید ہے) اور ایک اولوالعزم رسول و صدیق نبی۔ آپ کی اسی عظمت و جلالت قدر اور منصب نبوت کی عالمی مقامی کے پیش نظر کذبات ثلاثہ والی روایت کو ماضی و حال کے بہت سے جلیل القدر ائمہ اور علما نے بھی درایت کی روشنی میں مسترد کر دیا ہے۔ جن میں امام فخر الدین الرازی جیسے بڑے متکلم و عقلی مفسر بھی ہیں، جو فرماتے ہیں کہ ''انبیاے کرام علیہم السلام کی طرف کذب کی نسبت کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ راویوں کی طرف ہی کذب کی نسبت کر دی جائے۔''[٢]

١۔ مریم ١٩: ٤١۔

٢۔ ملاحظہ ہو، امام رازی: ''فلان يضاف الكذب إلى رواته أولى من أن يضاف إلى الأنبياء عليهم السلام'' ص ١٨٥ جلد ٢٢، تفسیر الفخر الرازی المشتہر بتفسیر الکبیر و مفاتیح الغیب، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، الطبعۃ الاولی ١٩٨١ء۔

اس روایت پر نقد کرنے والوں میں مولانا مودودی جیسے بڑے داعی و مصنف بھی شامل ہیں۔[۳]

تاہم روایتی علما بخاری کی اس روایت کے الفاظ میں وارد کذب کو توریہ و تعریض بتا کر توجیہ کرتے ہیں اور اس طرح بخاری کے راویوں کی ثقاہت کو بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، چاہے اس سے خود نبوت کے عظیم منصب اور ایک جلیل القدر نبی کی عظمت پر حرف ہی کیوں نہ آتا ہو!

حالاں کہ روایت میں جن پہلوؤں کو کذبات کہا گیا ہے، قرآن نے ان کا تذکرہ جس اسلوب میں کیا ہے، وہاں ان کو کذب بمعنی تعریض و توریہ کہہ کر بھی بات بنتی ہی نہیں ہے، تعریض و توریہ کو صریح کذب کوئی نہیں کہتا، جب کہ روایات میں صریحاً کذب کہا گیا ہے۔ صاحب "تدبر قرآن" مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں: "یہ اصل واقعہ کی سیدھی سادی شکل ہے جو الفاظ قرآنی سے سامنے آتی ہے۔ لیکن مفسرین نے معلوم نہیں کس طرح اس کے تحت بعض ایسی روایتیں نقل کر دی ہیں کہ جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم نے اس موقع پر غلط بیانی کی۔"[۴]

سوال یہ ہے کہ تعریض و توریہ کو صریح کذب کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ اس روایت میں کہا گیا ہے؟ اسی طرح کذب کو خطا و غلطی کے اور خلاف واقع بات کے معنی میں لینے سے بھی کیا عصمت انبیا و شان نبوت پر حرف نہیں آتا؟ ڈاکٹر اکرم ورک صاحب نے بڑا زور لگا کر ان توجیہات کے ذریعے سے حدیث کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے[۵] جس میں وہ یہ دعویٰ بھی کر گزرے کہ حضرت ابراہیم کا 'اني سقیم' (میری طبیعت ناساز ہے) کہنا بظاہر خلاف واقعہ تھا۔ "اس جملے کا عام مفہوم یہی ہے کہ میں جسمانی طور پر بیمار ہوں، لیکن یہ جواب حقیقت کے خلاف تھا، کیونکہ آپ کو اس وقت کوئی تکلیف نہیں تھی" (ص ۳۰۳)۔

سوال یہ ہے راویان حدیث اور ان کا دفاع کرنے والے اکرم صاحب وغیرہم کو کس ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ اس وقت حضرت ابراہیم کو کوئی تکلیف نہیں تھی اور انھوں نے ضرور خلاف واقعہ بات کہی؟ روایات کو بچانے کا شوق لوگوں کو کس دلدل میں ڈال دیتا ہے، اس کی یہ کلاسیکل مثال ہے! یہ توجیہ جو بعض روایات میں آئی ہے، یہ بھی اصلاً بائیبل کی روایات سے ہی ماخوذ ہے!

۳۔ ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاء حاشیہ ۶۰ ص ۱۶۲، جولائی ۲۰۱۱ء، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی۔

۴۔ دیکھیے: مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، جلد ششم، طبع تاج کمپنی دہلی، ص ۴۸۰۔

۵۔ ڈاکٹر محمد اکرم ورک، متون حدیث پر جدید ذہن کے اشکالات ایک تحقیقی مطالعہ، الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ، فروری ۲۰۱۲ء۔

بعض حضرات اس مشکل کو حسنات الابرار سیئات المقربین جیسے صوفیانہ لطائف سے حل کرنا چاہتے ہیں[6] لیکن یہ توجیہ بھی پاؤں چلنے والی محسوس نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ یہ ساری توجیہات کیوں؟ان کی ضرورت تو تب پڑے گی ناجب متن حدیث صحیح ثابت ہو جائے،اگر متن ہی موقوف ہو مرفوع نہ ہو(جیسا کہ اِس تحقیق سے ثابت ہو گا)توپھراس سارے قیل و قال کی ضرورت ہی کیا ہے جس کو کہا جا سکتا ہے کہ:

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

والد ماجد علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی کہتے تھے کہ قرآن کریم کی طرح حدیث کا بھی یہ معجزہ ہے کہ اگر کسی روایت میں سقم ہوتا ہے تو ایسے قرائین موجود ہوتے ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف یا موضوع ہے۔اس حدیث پر روایت ودرایت کے نقطۂ نظر سے ان کی تنقید ہم اہل علم کے لیے پیش کر رہے ہیں جو ان کی تفسیر ''مفتاح القرآن''اوران کی کتاب ''بخاری کا مطالعہ(دوم)'' سے ماخوذ ہے۔ضروری حواشی کا اضافہ راقم نے کر دیا ہے۔مرتب:ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی]

علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی تحریر کرتے ہیں:

حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے لوگوں سے فرمایا:'فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ': پس فرماں روائے کائنات کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔

حضرت ابراہیم انھیں بتا چکے تھے کہ تمھارے ان معبودوں میں کوئی شکتی نہیں، نہ تمھیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور آپ کا قصد تھا کہ کسی موقع پر ان معبودوں کی بے زوری ان کے پجاریوں کو ماتھے کی آنکھوں سے دکھا دیں۔اُن کے ایک تہوار نے جس میں سب لوگ رات کو شہر سے باہر جشن مناتے تھے یہ موقع فراہم کر دیا۔اس رات آپ کی طبیعت بھی کچھ ناساز تھی۔اس لیے جب گھرانے کے لوگوں نے رسمی طور پر آپ سے بھی چلنے کو کہا تو آپ نے متفکرانہ انداز میں تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا:میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، یہ سن کر وہ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔دراصل جب سے حضرت ابراہیم نے ان کے دین سے بے زاری ظاہر فرمائی تھی اور شرک وبت پرستی کو گم راہی بتایا تھا اور دعوت توحید دی تھی، وہ لوگ آپ سے متنفر ہو گئے تھے۔گھرانے کا ایک فرد اور پروہت آزر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے انھوں نے ہنوز آپ کے خلاف کوئی

۶۔ ملاحظہ ہو: مولانا شبیر احمد عثمانی، ترجمۂ قرآن، ص ۵۹۸ حاشیہ ۸، شائع کردہ سعودی عرب۔

کارروائی نہیں کی تھی، لیکن ان کے اور آپ کے درمیان نفرت کی گہری خلیج حائل ہو چکی تھی۔

اسی لیے جب آپ نے ان سے اپنی طبیعت ناساز ہونے کا ذکر کیا تو کسی نے آپ کے علاج و تیمار داری کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور سب کے سب بے پروایانہ انداز سے منہ موڑ کر پشت پھیر کر چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد آپ نے مندر میں جا کر بڑے بت کے سوا تمام بتوں کو توڑ ڈالا، جیسا کہ تفصیل کے ساتھ سورۂ انبیاء کے پانچویں رکوع (آیت ۵۱ تا ۷۰) میں گزر چکا ہے۔ یہاں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جب ابراہیم سے جشن میں چلنے کو کہا گیا:

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ. فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ. فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ. (الصافات ۳۷: ۸۸-۹۰)

''تو اس نے ستاروں میں، یعنی آسمان کی طرف ایک نظر ڈال کر کہا کہ میں بیمار ہوں۔ پس وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے پشت پھیر کر۔''

'فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ': وہ جھپٹ کر ان کے بتوں کی طرف گیا (جن کے سامنے چڑھاوے میں آئی ہوئی قسم قسم کی غذائیں اور مٹھائیاں رکھی تھیں) تو ان سے کہا: کیا تم کھاتے نہیں۔ تمھیں کیا ہوا تم بولتے نہیں پس وہ ان پر پل پڑا سیدھے ہاتھ سے مارنے کے لیے۔

پجاریوں کا گروہ جشن سے فارغ ہو کر واپس آ کر چڑھاوے کا مال سمیٹنے اور پوجا کرنے کے لیے مندر میں پہنچا تو بتوں کی توڑ پھوڑ دیکھ کر بہت سٹپٹایا کہ یہ کس اَن نِیائی کا کرتوت ہے۔ بس یہ ابراہیم کا ہی کام ہے۔ شہر کے بڑے لوگوں کو طلب کر کے انھوں نے اس کو ان کے سامنے حاضر کیا اور غیظ و غضب میں جھپٹ کر آپ سے پوچھنے لگے کہ کیا یہ کام تو نے کیا ہے؟

'فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ': پس متوجہ ہوئے اس کی طرف اس حال میں کہ جھپٹ رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم نے ان کے جواب میں فرمایا کہ ان میں باہم کچھ جھگڑا ہو گیا ہے۔ بڑے نے ناراض ہو کر چھوٹوں کو سزا دے ڈالی۔ خود ان ہی سے پوچھ لو۔ آپ کا یہ جواب سن کر وہ بہت جز بز ہوئے کہ ہم نے لوگوں کے سامنے اس بے باک جوان کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اس کی یہ سیدھی سادھی بات اگر ان کے دل میں بیٹھ گئی تو ہمارا اور ہمارے دھرم کا بیڑا غرق ہوا رکھا ہے۔ آخر لوگوں کی اندھی مذہبیت پر بھروسا کرتے ہوئے وہ بولے کہ تو عجیب آدمی ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ یہ مورتیاں بولا نہیں کرتیں۔ آپ نے فرمایا: جب ان میں کوئی شکتی نہیں، پھر ان کی پوجا کیوں کرتے ہو۔ انھیں تو خود تم انسان ڈھالتے تراشتے ہو، جس مورتی کو تم نے جیسا بنایا ویسی ہی بن گئی۔ پھر یہ مورتیاں تمھیں کیا نفع و نقصان پہنچا سکتی اور تمھاری بگڑی کیا بنا سکتی ہیں۔ اللہ کو ہی پوجو جو تمھارا بھی

خالق ہے اور ان پتھروں اور دھاتوں کا بھی خالق ہے، جن سے تم یہ مورتیاں بناتے ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے:

قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ. وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ. (الصافات ۳۷: ۹۵-۹۶)

”کہا ابراہیم نے: ہائے کیا تم اسے پوجتے ہو، جسے خود تراشتے ہو، حالاں کہ اللہ نے پیدا کیا ہے تمھیں بھی اور اس کو بھی جسے تم بناتے ہو۔“

اس قطعی حجت کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا بہ جز اس کے کہ سب نے طے کر لیا کہ ایک آتش کدہ تعمیر کر کے اس ادھرمی کو اس میں جھونک دو:

قَالُوا ابۡنُوۡا لَهٗ بُنۡيَانًا فَاَلۡقُوۡهُ فِی الۡجَحِيۡمِ. فَاَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَسۡفَلِيۡنَ. (الصافات ۳۷: ۹۷-۹۸)

”وہ (باہم) بولے، اس کے لیے ایک آتش کدہ تعمیر کر کے اسے دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دو۔ پس انھوں نے قصد کیا اسے نیچا دکھانے کی تدبیر کا تو ہم نے انھیں ہی نیچا کر دیا۔“

یعنی ان کا خیال تھا کہ اس فیصلہ سے ابراہیم کو ہوش آجائے گا، منت و سماجت کر کے معافی مانگے گا اور آیندہ ہمارے دھرم کے خلاف کبھی کوئی لفظ نہ کہے گا۔ اس طرح اس نے جو فتنہ اٹھایا ہے خود بخود آسانی سے دب جائے گا، لیکن حضرت ابراہیم کی پیشانی پر ایک شکن بھی نہ آئی تب آپ کو بادشاہ نمرود کے سامنے پیش کیا گیا۔ زچ ہو کر اس نے بھی مذہبی کونسل کے فیصلہ کی تائید کر دی اور آپ کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ اور اس فیصلہ پر عمل کرنے کی تیاری ہونے لگی۔ زبردست آتش کدہ تیار ہوا، تب آپ کو قید خانہ سے نکال کر وہاں لایا گیا۔ اسے دیکھ کر بھی نہ آپ کے چہرے پر خوف وہراس کی کوئی جھلک آئی، نہ زبان سے کوئی خوشامد یا معافی کا لفظ نکلا۔ آخر آپ کو دہکتے ہوئے آتش کدے میں پھینک دیا، مگر لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب انھوں نے دیکھا کہ آپ ہشاش وبشاش پورے اطمینان سے انگاروں پر ٹہل رہے ہیں۔ نمرود بادشاہ بے اختیار چیخ پڑا کہ ابراہیم نکل کر میرے پاس آجا۔ تو سچا ہے اور آسمان کا بادشاہ تیرا حمایتی ہے۔ اس طرح مشرکین کو ذلیل ہونا پڑا اور ان میں سے بہت سے لوگ آپ پر ایمان لے آئے، مگر جیسا کہ سورۂ ممتحنہ میں ہے: مشرکین اور مومنین میں چپقلش بڑھتی رہی۔ پھر کچھ مدت کے بعد نمرود کو مشرکین آپ سے بد ظن کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس نے کچھ لوگوں کو حکم دے دیا کہ جب تمھارا بس چلے ابراہیم کو قتل کر ڈالو۔ علاوہ بریں، آپ کا باپ آزر بڑا جاہل شخص تھا۔ اس نے آپ کو گھر سے نکل جانے کا الٹی میٹم دے دیا۔ ان حالات کی وجہ سے آپ نے وطن سے ہجرت کر جانے کا قصد فرما لیا۔ مومنین نے پوچھا کہ حضرت کہاں کا قصد ہے؟ فرمایا: کوئی خاص مقام میرے

پیش نظر نہیں ہے۔ میں تو یہ سرزمین اللہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں، جہاں جانے کا حکم ہو گا جاؤں گا اور جہاں ٹھیرنے کا ارشاد ہو گا ٹھیروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا رب مجھے مناسب مقام پر لے جائے گا:

وَقَالَ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ.
(الصافات ۳۷: ۹۹)

”اور کہا اس نے کہ میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، وہ مجھے راہِ راست چلائے گا۔“

چنانچہ آپ مع مومنین وطن سے نکل گئے۔ اس قافلۂ مہاجرین میں آپ کی بیوی حضرت سارہ تھیں جو آپ کے چچا کی بیٹی تھیں اور حضرت لوط علیہ السلام تھے جو آپ کے بھتیجے، یعنی حاران بن آزر کے فرزند تھے اور بچپن سے ہی آپ کی تربیت و کفالت میں رہتے چلے آئے تھے۔ عراق سے نکل کر آپ مختلف علاقوں میں تشریف لے گئے۔ معاش کا وسیلہ اس قافلۂ مہاجرین اور خانہ بدوش رہروان حق کے پاس بکریوں کے ریوڑ اور گایوں کے گلے تھے، لیکن کسی جگہ مستقلاً قیام پذیر نہیں ہوئے۔

جہاں پہنچے لوگوں کو توحید و دین حق قبول کر لینے کی دعوت دیتے۔ رفتہ رفتہ مملکت مصر میں داخل ہوئے۔ مصر کا بادشاہ اور اس کے ارکان دولت آپ کی دعوت سے متاثر ہوئے اور آپ پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ مصر نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی جو شاید اس کی بہن تھی اور حسن صورت و جمال سیرت میں یگانہ تھی آپ کی زوجیت میں دے دی، اس کا نام ہاجرہ تھا، ہنوز آپ لاولد تھے۔ سارہ کے بطن سے کسی بچہ کے ہونے کی توقع نہ تھی، کیونکہ ان کی عمر ڈھل چکی تھی اور وہ بانجھ تھیں۔ بائیبل کی تصریح کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام جب مصر پہنچتے ہیں تو ان کی بیوی سارہ تقریباً ۶۵ سالہ بوڑھی تھیں۔ آپ نے دعا فرمائی کہ الٰہی، مجھے ہاجرہ کے بطن سے کوئی فرزند عطا کر جو تیرے لائق بندوں میں سے ہو۔ یہ دعا قبول ہوئی اور آپ کو ایک بردبار، تحمل مزاج، نرم خو، صبر شیوہ فرزند کی بشارت دی گئی۔ آپ اہل و عیال اور قافلۂ مہاجرین کے ساتھ مصر سے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور بحکم حق وادی کنعان میں فروکش ہو گئے۔ یہیں قیام پذیر ہونے کا حکم ہوا اور یہیں حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔

چنانچہ ارشاد ہے کہ ابراہیم نے دعا کی:

رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ.
(الصافات ۳۷: ۱۰۰)

”اے میرے رب، مجھے عطا فرما (کوئی فرزند) لائق بندوں کی جنس میں سے۔“

یہ دعا آپ نے ہاجرہ سے شادی کر لینے کے بعد کی تھی:

فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیۡمٍ.
(الصافات ۳۷: ۱۰۱)

”پس ہم نے اسے ایک بردبار و فرزانہ لڑکے کی بشارت دی۔“

یہ فرزند آپ کو کس قدر عزیز ہوگا، ظاہر ہے۔ مگر جب وہ چند ماہ کا ہوا تو اللہ کا حکم آیا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو یہاں سے دور دراز لے جا کر ''وادی غیر ذی ذرع'' میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے ایسا ہی کیا اور جہاں اب چاہ زمزم ہے وہیں ماں بیٹے دونوں کو یکہ و تنہا چھوڑ آئے۔ اسمٰعیل تو شیر خوار بچہ تھے جسے ہنوز بولنا بھی نہ آیا تھا، مگر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی ہمت کی بلندی اور توکل کی پختگی پر قربان جائیے کہ جب حضرت ابراہیم نے انھیں بتایا کہ اللہ کا یہی حکم ہے تو فرمایا: پھر ہمیں کیا پروا، ہمارا رب ہمیں ضائع نہ فرمائے گا۔ پھر وہاں قبیلہ جرھم آبسا، وہ لوگ حضرت ہاجرہ کو اپنی ماں اور مالکہ کی طرح مانتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے تو سب آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور ایمان لے آئے۔ حضرت ابراہیم وقتاً فوقتاً بیوی اور فرزند سے ملنے کے لیے تشریف لایا کرتے، مگر مستقلاً قیام کنعان میں ہی رہتا، حتیٰ کہ حضرت اسمٰعیل تقریباً بارہ سال کے ہو گئے تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آ کر انھیں بتایا کہ بیٹا میں نے خواب دیکھا ہے کہ تجھے قربان کر رہا ہوں۔ عرض کیا: ابا جان! حکم کی تعمیل فرمائیں۔ آپ مجھے ان شاء اللہ صابر اور چون وچرا نہ کرنے والا پائیں گے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی سیرت جن اوصاف حسنہ سے مرکب تھی، ان میں وصف حلم نمایاں تر تھا اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت اسحٰق علیہ السلام کی سیرت میں وصف علم نمایاں تر تھا، اسی لیے قرآن کریم میں جہاں حضرت اسحٰق کی بشارت کا ذکر ہے تو آپ کو ''غلام علیم'' کہا ہے (الحجر ۱۵: ۵۳۔ الذاریات ۵۱: ۲۸)۔ حضرت اسحٰق کی نسل بھی حضرت اسمٰعیل کی نسل کی بہ نسبت علم میں ممتاز رہی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک بنی اسمٰعیل میں پڑھے لکھے لوگوں کی سخت کمی رہی ہے، لیکن بنی اسرائیل ہر دور میں پڑھی لکھی قوم کی حیثیت سے جانے گئے اور اہل علم و اہل کتاب سمجھے گئے ہیں۔ لیکن اللہ کے خوف اور اخروی بازپرس کے احساس سے محروم ہونے کی وجہ سے بہت سے یہودیوں نے علم اور قلم کی طاقت سے بڑے مظالم بھی ڈھائے ہیں۔ انبیاے کرام کے صحیفوں میں کتر بیونت، بے ہودہ اضافے، جھوٹے افسانے، انبیاے کرام کی سیرت کو داغ دار بنا دینے والے بہتانات، انھوں نے اپنی کتابوں میں خوب لکھے ہیں (جس کا کچھ کچھ اندازہ علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی کتاب ''ذبیح کون ہے؟'' سے ہوتا ہے۔ غ)[7]۔ یہودی مصنفین کے تصنیف کیے ہوئے جو جھوٹے افسانوں میں سے حضرت سارہ و ہاجرہ رضی اللہ عنہما کے متعلق افسانہ

۷۔ مولانا حمید الدین فراہی، ذبیح کون ہے؟ ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی، شائع کردہ: دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ یوپی۔ خاص طور پر باب دوم کی فصل تیرھویں دلیل یہود کی تحریفات اور ان کی تردید، ص ۱۲۰۔

بھی ہے (جو حدیث و تفسیر کی کتابوں میں حدیث مرفوع کے طور پر بھی نقل ہو گیا ہے (غ)، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''حضرت ابراہیم، جب کہ آپ کی عمر ۷۵ (پچھتر) سال سے بڑھ چکی تھی اور آپ کی بیوی سارہ ۶۵ سال سے متجاوز تھیں، مصر پہنچے۔ مصر کا بادشاہ بڑا ظالم و عیاش تھا۔ باہر سے آنے والوں میں کوئی خوبصورت عورت ہوتی اور اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی ہوتا تو وہ شوہر کو قتل کرا دیتا اور عورت کو اپنے پاس رکھ لیتا۔ اور اگر شوہر کے بجائے بھائی اس کے ساتھ ہوتا تو اسے قتل نہ کیا جاتا بس ایک دو رات عورت محل میں رکھ کر بھائی کو واپس دے دی جاتی۔ حضرت ابراہیم وہاں پہنچے تو اپنی جان کا فکر ہوا۔ سارہ حسن و جمال میں نادرۂ روزگار اور چندے آفتاب و چندے ماہتاب تھیں۔ حسب دستور بادشاہ کے گماشتے سارہ کو شاہی محل میں لے جانے کے لیے آ گئے۔ حضرت ابراہیم نے سارہ کو یہ پٹی پڑھائی کہ جب تم بادشاہ کے پاس پہنچو تو مجھے اپنا شوہر نہ بتانا، بھائی بتا دینا کہ میری جان تو بچ جائے۔''

کتاب البیوع بخاری کی روایت میں یہ ہے کہ ابراہیم نے سارہ سے کہا تھا: 'واللہ ان علی الارض مؤمن غیری وغیرک محدث' میرٹھی رحمہ اللہ کے مطابق یہ قرآن سے صریح متعارض ہے، کیونکہ جب آپ اپنی قوم سے نکلے ہیں تو آپ کے ساتھ آپ کے بھتیجے لوط بن حاران بھی تھے اور دوسرے مومنین بھی جن کو قرآن پاک مومنین کے لیے اسوہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔[۸] 'قد كانت لكم اسوة حسنة فی ابراهيم والذين معه الآية' ('والذين معه' کی تشریح مولانا عثمانی یوں کرتے ہیں، یعنی جو لوگ مسلمان ہو کر ابراہیم کے ساتھ ہوتے گئے۔ ترجمہ شبیر احمد عثمانی ص ۷۲۸) سارہ بادشاہ کے پاس خلوت میں لے جائی گئیں۔ اس نے بد قسمتی کے ساتھ ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شل ہو گیا، تب اس نے منت سماجت کی کہ میرے لیے دعا کر، وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے کچھ نہ کہوں گا۔ سارہ نے دعا کی تو ہاتھ ٹھیک ہو گیا، مگر اس نے بقصد شرارت دوبارہ ہاتھ بڑھایا تو پہلی بار سے بھی بڑھ کر آفت پیش آئی۔ پھر وعدہ کیا اور پھر خلاف ورزی کی، اس لیے اور بھی سخت تر کیفیت سے دوچار ہوا۔ پھر نہایت پختہ وعدہ کیا، دعا کے طفیل میں نجات مل گئی تو حضرت سارہ کو عزت و اکرام کے ساتھ واپس کر دیا اور خدمت کے لیے ایک لونڈی بھی عطا کر دی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ (کتاب البیوع میں امام بخاری نے یہ روایت ذکر کی ہے۔ علامہ میرٹھی نے اس پر بھی تفصیلی نقد کیا ہے۔)[۹]

۸۔ اس پر نقد کے لیے ملاحظہ ہو: بخاری کا مطالعہ، جلد دوم، ص ۲۴۲ تا ۲۵۶، فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، ۲۰۰۲ء۔

۹۔ اس پر نقد کے لیے ملاحظہ ہو: بخاری کا مطالعہ، جلد دوم، ص ۲۴۲ تا ۲۵۶، فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، ۲۰۰۲ء۔

وہ لونڈی کو ساتھ لیے ہوئے واپس حضرت ابراہیم کے پاس پہنچیں اور ماجرا سنایا۔ ابراہیم وہاں سے سارہ اور ان کی خادمہ ہاجرہ کو لے کر روانہ ہوئے۔ کنعان پہنچے تو چونکہ سارہ لاولد تھیں، اس لیے انھوں نے دعا کی کہ ہاجرہ سے ان کو اولاد عطا ہو، ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیل پیدا ہوئے تو اب وہ ہاجرہ سے حسد کرنے اور اس پر ظلم توڑنے لگیں۔ غریب کے ناک کان چھید دیے، ابراہیم سے ملنے پر پابندی لگا دی۔ اس پابندی کا خاطر خواہ اثر نہ نکلا تو ابراہیم کو مجبور کیا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو میری آنکھوں سے دور کر دو۔ ایسی جگہ لے جا کر چھوڑو جہاں نہ کوئی آبادی ہو نہ پانی ہو، بیوی کے حکم سے مجبور ہو کر حضرت ابراہیم دونوں کو لے کر اس سرزمین میں چھوڑ آئے جہاں بعد میں مکہ آباد ہوا۔ (بائیبل میں یہ کہانی مختلف ٹکڑوں میں آئی ہے: ملاحظہ کریں: کتاب پیدائش باب ۱۲ آیات: ۱۱-۲۰ اور پیدائش باب ۲۰ آیات ۲-۱۶، غ)

اس شروع سے آخر تک قطعی جھوٹی کہانی تصنیف کرنے کا مقصد صرف یہ دکھانا تھا کہ یوں تو بنی اسمٰعیل بھی حضرت ابراہیم کی ذریت ہیں، لیکن نسب میں بنی اسرائیل سے کمتر و کہتر ہیں، کیونکہ بنی اسرائیل سارہ کی نسل سے ہیں جو حضرت ابراہیم کی ہم نسب اور عم زاد تھیں۔ اور بنی اسمٰعیل ہاجرہ کی نسل سے ہیں جو سارہ کی مملوکہ و خادمہ تھیں۔ اس خبیث مقصد کی خاطر ان پڑھے لکھے جاہلوں نے بائیبل اور تلمود میں یہ کہانی گھڑ کر درج کر دی تھی۔ بنی اسمٰعیل کو کچھ علم نہ تھا کہ اسرائیلیوں نے محض اپنے نسب کی برتری ظاہر کرنے کے لیے کیا تاریخی ظلم ڈھا رکھا ہے، کیونکہ عموماً بنی اسمٰعیل ان پڑھ تھے۔ ان میں سے بعض افراد کو لکھت پڑھت سیکھنے کی ضرورت پڑی تو وہ معمولی نشست و خواند سے آگے نہ بڑھ سکے۔ عبرانی و یونانی زبانوں سے تو وہ قطعاً نا آشنا تھے، جب کہ یہود کی تمام مذہبی کتابیں عبرانی اور یونانی میں ہی تھیں۔ ان کی کسی بھی کتاب کا عربی زبان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک کبھی بھی ترجمہ نہیں ہوا، اس لیے اسمٰعیلیوں میں جو اشخاص برائے نام پڑھے لکھے بھی تھے، وہی اسرائیلی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے عاجز تھے۔

حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عہد رحمت آگیا اور عامۃ المسلمین دریاے علم میں شناوری کرنے لگے، لیکن صحابۂ کرام کو قرآن کریم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ہی یاد کرنے کرانے سے دل چسپی تھی۔ اسرائیلی کتابوں کے مطالعہ کا انھیں کبھی شوق نہ ہوا بجز عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہا کے کہ انھوں نے اسرائیلی کتابوں کا مطالعہ کر کے حاصل مطالعہ ایک کتاب میں ثبت کیا تھا۔ اس کا نام انھوں نے ''الصحیفۃ'' رکھا تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی باتیں بھی الگ کتاب میں لکھی تھیں۔ اس کا

نام ''الصحیفۃ الصادقۃ'' رکھا تھا۔

البتہ حضرت ابوہریرہ حضرت عبد اللہ بن عباس اور بعض دیگر صحابہ نومسلم علماے اہل کتاب کی بیان کردہ باتیں سن لیا کرتے اور مسلمانوں سے ان کو نقل بھی کر دیتے اور اعتماد کی وجہ سے بسا اوقات اس شخص کا نام بھی ذکر نہ کرتے جس سے انھوں نے وہ باتیں سنی ہوتیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس نے تو ان نومسلم علماے اہل کتاب کی بیان کردہ بعض باتوں پر گرفت بھی کی ہے، مگر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے خاص طور سے کعب احبار [10] سے سنی ہوئی بہت سی باتیں بدون نقد و نکیر اور کعب کا نام لیے بغیر بیان کر دی ہیں، [11] جنھیں نیچے کے بعض راویوں نے غلطی سے حدیث مرفوع کے طور پر بیان کر دیا۔ سننے والوں کو دھوکا لگ گیا کہ یہ باتیں ابوہریرہ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھیں، لہٰذا قطعاً صحیح ہیں۔ اس طرح اہل کتاب کی متعدد اناپ شناپ باتیں

۱۰۔ ترجمہ کعب بن احبار: حمید بن عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں قریش کی ایک جماعت سے بات کرتے ہوئے سنا، جس میں کعب احبار کا ذکر بھی آیا تو فرمایا: جو لوگ ہمیں اہل کتاب کی روایتیں سناتے ہیں، ان میں تو وہ سب سے سچے تھے، مگر اس کے باوجود ہمیں ان سے جھوٹ کا تجربہ ہوتا رہتا تھا: 'وان کنا مع ذلک لنبلو علیه الکذب'۔ (دیکھیے: تہذیب التہذیب، ص ۳۹۴ الجزء الثامن حرف الکاف الطبعۃ الاولی دار الفکر ۱۹۸۴ء)۔

۱۱۔ کعب احبار کی روایات پر محقق ائمۂ متقدمین کو خود بھی تحفظات تھے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اُن تابعین کے اقوال نقل کر کے جن سے حضرت اسحٰق کے ذبیح ہونے کا قول مروی ہے، لکھا ہے: 'وهذه الأقوال کلها مأخوذة عن کعب الأحبار فإنه لما أسلم في الدولة العمرية جعل یحدث عمر رضي الله عنه عن کتبه القدیمة فربما استمع له عمر رضي الله عنه فترخص الناس في استماع ما عنده و نقلوا ما عنده عنه غثها و سمینها و لیس لهذه الأمة حاجة إلی حرف واحد مما عنده'، یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ شخص مسلمان ہوا اور اپنی قدیم کتابوں سے ان کو سنانے لگا۔ کبھی کبھی حضرت عمر اس کی باتیں سن لیا کرتے، جس سے لوگوں نے اس کی روایات سننے اور جو کچھ بھی رطب و یابس وہ بتاتا تھا، اس کو سننے اور نقل کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا، حالاں کہ اُس نے جو کچھ بھی نقل و روایت کیا ہے، اِس امت کو اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے (ص ۳۳، الجزء السابع سورہ الصافات تفسیر القرآن العظیم للامام الحافظ ابن کثیر الدمشقی تحقیق سامی بن محمد سلامہ دار طیبہ للنشر والتوزیع الطبعۃ الثانیہ ۱۹۹۹ء)۔

کتب حدیث و تفسیر میں احادیث نبویہ کے طور پر جگہ پا گئیں۔ ازاں جملہ یہ حدیث ہے کہ حضرت ابراہیم نے عمر میں تین بار جھوٹ بولا تھا۔ ایک بار اس وقت جب بتوں کو توڑنے کے لیے بیماری کا بہانہ کر دیا تھا۔ دوسری بار اس وقت جب یہ کہہ دیا تھا کہ ان بتوں کو بڑے بت نے توڑا ہے۔ تیسری بار اس وقت جب اپنی بیوی سارہ کو بادشاہ مصر کے ڈر سے اپنی بہن بتا دیا تھا، مگر یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ نہیں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: 'حدثنا سعيد بن تليد الرُعَيْني أخبرني ابن وهب أخبرني جرير بن حازم عن أيوب عن محمد عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لم يكذب إبراهيم إلا ثلاثًا. ح و حدثنا محمد بن محبوب ثنا حماد بن زيد عن أيوب عن محمد عن أبي هريرة قال: لم يكذب إبراهيم إلا ثلاث كذبات الخ' (صحیح البخاری، ص ۵۰۹ طبع ہندی قدیم)۔

(واضح رہے کہ یہ روایت مسلم، ترمذی اور ابوداؤد میں بھی آئی ہے، تاہم اصل سب کی یہی بخاری کی روایت ہے۔ غ)۔ (یعنی حضرت ابوہریرہ سے یہ حدیث محمد بن سیرین نے اور ان سے ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی نے سنی تھی اور ایوب سے دو شخصوں جریر بن حازم و حماد بن زید نے روایت کی۔ بروایت جریر بن حازم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ نہیں بولے، مگر تین"۔ اس طریق سے یہ حدیث مرفوع کے طور پر آئی ہے، جب کہ بروایت حماد بن زید عن ایوب عن محمد عن ابی ہریرہ کے طریق میں یہ ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ابراہیم علیہ السلام نے نہیں جھوٹ بولے، مگر تین"۔ اس طریق سے یہ حدیث موقوف ہے اور یہی طریق راجح ہے۔ (غ)

اور ائمۂ رجال نے تصریحات کی ہیں کہ جریر بن حازم ضعیف الحفظ تھے۔[۱۲] جریر کی بیان کردہ ان ہی حدیثوں

۱۲۔ ترجمہ جریر بن حازم: جریر بن حازم ثقہ ہیں، مگر اختلاط کا شکار ہو گئے تھے: 'قال أحمد بن سنان عن ابن مهدي جرير بن حازم اختلط وكان له أولاد أصحاب حديث فلما أحسوا ذلك منه حجبوه فلم يسمع أحد منه في حال اختلاطه شيئًا' (احمد بن سنان نے ابن مہدی سے جریر کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ وہ اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، اس لیے ان کے بچے ان کو لوگوں سے ملنے نہ دیتے تھے) (تہذیب التہذیب، ص ۶۱، جلد ثانی، باب الجیم، طبع دار الفکر ۱۹۸۴ء)۔ عبد اللہ بن احمد کہتے ہیں کہ میں نے ابن معین سے جریر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: 'ليس به بأس وعن قتادة ضعيف' (کام چلاؤ ہیں، لیکن قتادہ سے روایت کرنے میں ضعیف

پر اعتماد کیا جاتا ہے جو جریر نے اعمش سے سنی تھیں۔ جریر کی اسناد میں ہے کہ ابوہریرہ نے کہا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، لیکن حماد بن زید نے جو جریر سے بدرجہا قوی تر اور ثبت و ثقہ محدث تھے۔[13] اس کی اسناد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اسے خود ابوہریرہ کے قول کے طور پر بیان کیا ہے۔ الحاصل جریر نے اسے حدیث مرفوع کے طور پر بیان کیا ہے اور حماد بن زید نے حدیث موقوف اور قول ابوہریرہ کے طور پر۔ پس اسے مرفوع، یعنی حدیث نبوی بتا دینا جریر بن حازم کا وہم ہے۔ یہ مرفوع حدیث نہیں ہے، بلکہ حضرت ابوہریرہ کی بیان کی ہوئی بات ہے جو انھوں نے کعب احبار یا کسی اور شخص سے سن کر نقل کر دی تھی اور اس نے تلبیس یہ کی تھی کہ بائیبل میں حضرت ابراہیم و سارہ کی جو عمر مذکور ہے، اسے ذکر نہیں کیا، ورنہ ابوہریرہ سمجھ لیتے کہ یہ محض جھوٹ ہے۔

بھلا سوچیے تو سہی ۶۵ سال سے متجاوز کوئی بوڑھی عورت خواہ وہ صحت مند ہی ہو اور خواہ وہ جوانی میں حسن کے لحاظ سے یکتائے زمانہ رہی ہو کیا ایسی ہو سکتی ہے کہ اس پر کوئی عیاش بادشاہ فریفتہ ہو کر بدنیتی کے ساتھ اس کا قصد کرے۔ نہ ہی عقل یہ تصور کر سکتی ہے کہ حضرت سارہ علیہا السلام جو شروع سے ہی حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میں دین کی خاطر ہر طرح کی صعوبتیں جھیلتی رہیں، ان کے دل میں حسد جیسی ناپاک صفت ہو اور حضرت ابراہیم ایسے زن مرید ہوں کہ محض بیوی کے کہنے میں آ کر ایسی زیادتی کر گزریں جو اس کہانی میں

ہیں)۔ 'وقال النسائي: ليس به بأس' (نسائی نے بھی ان کو کام چلاؤ ہی قرار دیا ہے (ایضاً)۔ یعنی ائمۂ رجال نے ان کی توثیق بڑے مضبوط انداز میں نہیں، بلکہ ڈھیلے ڈھالے اسلوب میں کی ہے۔

۱۳۔ ترجمہ حماد بن زید: ابن مہدی کہتے ہیں کہ اپنے زمانوں میں چار آدمی لوگوں کے امام رہے ہیں کوفہ میں سفیان ثوری حجاز میں مالک، شام میں اوزاعی اور بصرہ میں حماد بن زید۔ فطر کہتے ہیں میں مالک کے پاس گیا انھوں نے اہل بصرہ میں سے صرف حماد بن زید کے بارے میں مجھ سے پوچھا۔ ابن مہدی کہتے ہیں کہ میں نے حدیث و سنت کا حماد سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا، اور کہتے ہیں کہ بصرہ میں حماد بن زید سے بڑا فقیہ کوئی نہیں۔ یزید بن زریع سے حماد بن سلمہ اور حماد بن زید کے بارے میں پوچھا گیا، دونوں میں کون زیادہ احفظ ہے تو کہا: حماد بن زید یحییٰ بن یحییٰ نیساپوری کہتے ہیں کہ حماد بن زید سے احفظ کوئی نہیں دیکھا۔ احمد و ابوزرعہ و ابن عیینہ نے ان کو ثقہ، حجۃ، کثیر الحدیث، اصح حدیثاً واتقن جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے خلاصہ یہ کہ ان کی جلالت قدر پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ دیکھیے: تہذیب التہذیب، ص ۶۱، الجزء الثالث حرف الحاء طبع دار الفکر ۱۹۸۴ء۔

مذکور ہے۔

علامہ میرٹھی نے مزید لکھا ہے: ''بخاری نے جریر بن حازم و حماد بن زید، دونوں کی اسناد ذکر کر کے طالبان حدیث کی یہ بجا رہنمائی فرمائی ہے کہ جریر بن حازم چونکہ بدحفظ اور کثیر الخطا راوی تھا اور حماد بن زید ثبت و ثقہ ہے، جریر سے بدرجہا فائق و افضل ہے، اس لیے حماد کی اسناد ہی صحیح و قابل اعتماد ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں، بلکہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ذکر کی ہی کہانی ہے، جریر بن حازم نے وہم و غلطی سے اسے مرفوع حدیث قرار دیا ہے، یعنی اس کی اسناد میں 'قال رسول الله ﷺ' کہنا جریر بن حازم کی غلطی ہے۔ معمر کی اسناد بھی حماد بن زید کی طرح ہے۔ معمر نے بھی یہ قصہ ابوہریرہ کی کہی ہوئی کہانی کے طور پر نقل کیا ہے (فتح الباری ج ٦)''۔[14]

ہشام بن حسان سے عبد الوہاب بن عطا خفاف (موزہ فروش) نے روایت کی ہے، جو سنن ابی داؤد میں ہے: کہا ہے: 'حدثنا محمد بن المثنى ثنا عبد الوهاب ثنا هشام عن محمد بن سيرين عن أبي هريرة عن النبي ﷺ إن إبراهيم عليه السلام لم يكذب إلا ثلاثًا الخ' (سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق باب في الرجل يقول لامرأته يا أختي)۔ اس کی اسناد میں 'عن النبي ﷺ' عبد الوہاب کی غلط بیانی ہے۔ عبد الوہاب بن عطا ضعیف و غیر ثقہ شخص تھا۔[15]

خلاصہ یہ ہے کہ ثلاثہ کذبات والی حدیث اصلاً مرفوع نہیں، بلکہ موقوف ہے اور یہ حضرت ابوہریرہ کا قول ہے، جس کا ماخذ اہل کتاب سے سنی ہوئی باتیں ہیں، نہ کہ قول رسول۔ راویوں نے اپنے تصرف سے اس کو حدیث مرفوع بنا دیا ہے۔ (غ)

۱۴۔ علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی: بخاری کا مطالعہ، جلد دوم ص ۳۵۱۔

۱۵۔ عبد الوہاب کو کئی ائمہ نے ثقہ قرار دیا ہے، لیکن ساجی کہتے ہیں: 'صدوق ليس بالقوي عندهم'، بخاری نے کہا: 'ليس بالقوي عندهم وهو يحتمل' اور نسائی نے بھی 'ليس بالقوي' کہا ہے۔ یہ ساری تعبیرات بتاتی ہے کہ راوی میں ضعف ہے اور وہ بس کام چلاؤ راوی ہے۔ ملاحظہ ہو: تہذیب التہذیب، الجزء السادس، ص ۳۹۹، حرف العین، الطبعۃ الاولی دار الفکر، ۱۹۸۴ء۔

شاہد رضا

اسلام کی افضلیت

[جناب جاوید احمد غامدی کی تحریروں اور ویڈیوز سے اخذ و استفادہ پر مبنی]

سوال: کیا اسلام سب سے افضل مذہب ہے؟

جواب: اس سوال میں ایک مغالطہ ہے جسے دور کر لینا چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ جب یہ سوال کیا جاتا ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مذہب یہودیت ہے اور ایک مذہب عیسائیت ہے۔ دنیا میں حقیقت کو جاننے کے لیے تین طریقے اختیار کیے گئے ہیں:

پہلا طریقہ فلسفیوں نے اختیار کیا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمیں اللہ نے عقل دی ہے، ہم اسے استعمال کر کے یہ جان سکتے ہیں کہ خدا کیسا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ مزید یہ کہ ہم یہ بھی جان سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہو گی۔ اس کی کم و بیش پانچ ہزار سال کی تاریخ ہے۔ قریب کی تاریخ بھی پڑھیں تو ۴۷۰ قبل مسیح میں سقراط ہوا ہے۔ اس کے بعد سے لے کر مغربی فلسفے کی یہ تاریخ پھر بھی کم و بیش دو ڈھائی ہزار سال کی ہے۔ آخر میں یہ اعتراف کر لیا گیا کہ عقل انسانی اپنے طور پر مابعد الطبیعیات (metaphysics) اور اخلاقیات (ethics) کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتی یا خود دریافت نہیں کر سکتی۔ پھر عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ ہم مادے کے اوپر تحقیق کریں گے۔

دوسرا طریقہ ہندوستان میں، خاص طور پر بعض ان لوگوں نے اختیار کیا جو کہتے تھے کہ ہمارے نفس میں ایک دنیا آباد ہے۔ اس کو وہ اپنی اصطلاح میں ''سیر باطن'' کہتے ہیں، یعنی ہم ایسی ریاضتیں اور مشقیں کرتے ہیں جن

سے ہمارے باطن کی دنیا سے حقیقت تک پہنچنے کا راستہ مل جاتا ہے، پھر ہم خدا سے براہ راست بات کر لیتے ہیں اور اس سے ہدایت حاصل کر لیتے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا، ان کے نقطۂ نظر کو ''صوفیانہ مذاہب'' (mystical religions) کہا جاتا ہے۔ ان صوفیانہ مذاہب میں بعض اپنے کمال کو بھی پہنچے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا مذہب بدھ مت ہے۔ جس مذہب کو آپ الہامی مذہب کہتے ہیں، اس کا اصول ہی بالکل دوسرا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں میں سے کسی کا انتخاب کرتے ہیں، یعنی وہ کوئی ریاضت یا چلہ نہیں کرتا، وہ کسی غار میں بیٹھ کر مراقبہ نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کا انتخاب کرتے ہیں اور انتخاب کر کے اسے اپنا پیغمبر بنا دیتے ہیں۔ پھر ان کے ذریعے سے انسانوں تک اپنی ہدایت پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے حقیقت تک پہنچنے کے تین طریقے اختیار کیے گئے:

عقل کے ذریعے سے،

سیر باطن یا نفسی مشاہدات کے ذریعے سے،

اور الہامی مذہب کے ذریعے سے۔

الہامی مذہب میں خدا حقائق بتا دیتا ہے اور عقل اس کو سمجھ لیتی ہے، یعنی مذہب میں عقل دریافت نہیں کرتی، بلکہ اس کو سمجھتی ہے۔ اس میں بھی عقل ہی کام کرتی ہے، لیکن اسے روشنی مل جاتی ہے تو وہ اس کو سمجھ لیتی ہے۔ لہٰذا الہامی مذاہب کے بارے میں ہمیں قرآن مجید نے بتایا ہے کہ یہ اصل میں الگ مذاہب ہی نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک ہی مذہب اور ایک ہی دین ہے، جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام سے دینا شروع کیا اور تمام پیغمبر اسی کو لے کر آئے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبر ایک ہی دین پیش کرتے رہے ہیں۔ اس دین میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو کچھ فرقے بن گئے، وہ یہودی اور نصرانی ہیں اور جو کچھ فرقے آپ کے جانے کے بعد بن گئے، وہ دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث ہیں۔

لہٰذا اسلام ایک ہی دین ہے۔ اس وجہ سے الہامی مذاہب میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ ان سب کا پیغام بھی ایک ہی ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے، ایک دن اس کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اور جواب دہی کی بنیاد صحیح علم اور عمل ہے۔ چنانچہ اگر مذاہب میں امتیاز دیکھنا ہو تو اسلام کا صوفیانہ مذاہب (mystical religions) یا فلسفے سے تقابل کریں۔ چنانچہ تمام الہامی مذاہب میں ایک ہی تصور پایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ سب فرقے ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی بن گئے اور اب بھی بن گئے ہیں۔ قرآن مجید تو صاف کہتا ہے کہ:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ.

(الشوریٰ ۴۲: ۱۳)

”اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اُس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی، (اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ (اپنی زندگی میں) اِس دین کو قائم رکھو اور اِس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔“

قرآن مجید تمام پیغمبروں کا نام لے کر کہتا ہے کہ اے پیغمبر، ہم نے آپ کو کوئی نیا دین نہیں دیا، بلکہ یہ وہی دین ہے جو ہم نے گذشتہ انبیا علیہم السلام کو دیا تھا۔[۱]

۱-https://ghamidi.com/videos/is-islam-superior-to-all-other-religions-6374

معاذ بن نور

مومن کی امیدوں کا محور

[جناب جاوید احمد غامدی کی ویڈیوز کی ٹرانسکرپشن پر مبنی سوال و جواب]

سوال: مومن اپنی پریشانی اور غم کا شکوہ کس سے کرتا ہے؟

جواب: میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں۔ یہی ایک بندۂ مومن کے شایان شان ہے۔ وہ اپنے غم والم کا اظہار اپنے رب ہی سے کرتا ہے، اس لیے کہ اس کی تمام امیدیں اسی سے وابستہ ہوتی ہیں اور وہ جانتا ہے کہ اس کی یہ گریہ وزاری بالآخر اس کے پروردگار کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے۔

یعنی اسے اگر دعا کرنی ہے تو اپنے رب سے، شکوہ کرنا ہے تو اپنے رب سے، گلہ کرنا ہے تو اپنے پروردگار سے، اپنے غم اور پریشانی کا اظہار کرنا ہے تو اسی کے سامنے۔ ایک بندۂ مومن کا یہ تعلق ہونا چاہیے اپنے پروردگار سے۔ اس کے بعد پھر دنیا میں جزع فزع، ماتم، دوسروں سے گلہ، ہر موقع پر ایک داستان لے کر آپ بیٹھے ہوئے ہیں، فلاں نے یہ کر دیا، فلاں نے وہ کر دیا یہ پھر بے معنی باتیں ہو جاتی ہیں۔

یعنی آدمی کی پوری زندگی اس سے عبارت ہوتی ہے کہ وہ سعی کرے گا، ہر مرحلے پر کوشش کرے گا کہ عدل و انصاف کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے، ایسے میں دوسری جانب سے کسی بے انصافی اور غلط رویہ سے سابقہ پیش آجاتا ہے، ایسی ایسی آزمایشیں آجاتی ہیں کہ (یوسف علیہ السلام کی طرح) سترہ، اٹھارہ سال کے لیے اٹھا کر آپ کو زندان میں ڈال دیا جاتا ہے، اس میں کیا کیا شکوے دل میں پیدا نہیں ہوئے ہوں گے، لیکن ایک بندۂ مومن یہ سمجھتا ہے کہ مجھے دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔

دنیا میں بڑا حسن ہے، بڑا جمال ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، ربوبیت کی کرشمہ سازی ہے، اس سب کے

باوصف یہ دنیاہر ہر جگہ پر ناقص ہے، سوائے ایک چیز کے، یعنی دار الامتحان ہونے کے لحاظ سے آخری درجے میں یہ کامل ہے، اس لیے کہ یہ بنائی ہی اس لیے گئی ہے۔ اس میں جتنے نقائص ہیں، وہ رکھے ہی اس لیے گئے ہیں کہ امتحان ہر ہر جگہ، ہر ہر پہلو، ہر ہر مرحلے پر ہو سکے اور کوئی چیز امتحان سے فرار کا ذریعہ نہ بن سکے، یعنی انسان کی کوئی تدبیر اس کو کمرۂ امتحان سے باہر نہ لے جا سکے۔ یہ لحاظ رکھا گیا ہے اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے جیسے ترتیب دیا ہے۔ اس میں وہ دنیا کے جس میں اللہ تعالیٰ تمام نقائص کو دور کر دے گا اور اپنے کمال ہنر کا اظہار کرے گا وہ آخرت کی دنیا ہے، جنت کی دنیا ہے۔

لہٰذا اس عارضی دنیا کی زندگی کو اس حقیقت ہی کے طور پر سمجھ کر اس سے متعلق درست رویہ بھی اختیار کرنا چاہیے اور وہ رویہ کیا ہے، وہ یہی ہے کہ میرا غم میرا شکوہ میرے رب کے لیے ہے، میں تم سے کوئی بات نہیں کرتا۔[1]

(سورۂ یوسف آیت ۸۶ کے درس قرآن سے ماخوذ اقتباس)

انفاق اور دل کی وسعت: حقیقی غنا کا معیار

سوال: غنی انسان دل سے ہوتا ہے یا پیسے سے؟

جواب: انسان کے اندر انفاق کا جذبہ ہو تو پھر وہ دس روپے میں سے بھی انفاق کرتا ہے اور نہ ہو تو کروڑوں میں سے بھی نہیں کرتا۔ یعنی اصل میں یہ انسان کا رویہ ہے۔

جیسے کہ اس موقع پر جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انفاق کی اپیل کی تو سامنے آیا کہ ایک طرف جو کھاتے پیتے لوگ تھے، وہ اپنا مال لے کر آئے، تبوک کے موقع پر، اور ایک طرف وہ مزدور بھی کچھ کھجوریں لے کر آگیا جس نے یہ کہا کہ میں نے رات بھر مزدوری کر کے یہ چند کھجوریں ہی کمائی ہیں، اس لیے یہی حاضر ہیں۔ حضور نے ان کھجوروں کو اس سارے مال کے اوپر پھیلا دیا اور فرمایا کہ ان کی قدر و قیمت اس سارے مال سے زیادہ ہے۔

تو اصل میں کشادگی ہو یا تنگی ہو، یہ انسان کا داعیہ اور جذبۂ ایمان ہے جس کی بنیاد پر وہ انفاق کرتا ہے، یعنی یہ کوئی عذر نہیں ہے کہ آدمی کہے کہ میرے پاس ہے کیا؟ جس طرح سے وہ تھوڑے میں سے بھی اپنی ضروریات

۱-https://www.facebook.com/share/v/otqgKASDXRKnwYj9/?mibextid=oFDknk

پوری کر رہا ہوتا ہے اگر خیال ہو کہ مجھے جنت میں بھی اپنی جگہ بنانی ہے تو اس میں سے انفاق بھی کرتا رہتا ہے۔

پھر فرمایا اور جن پر خرچ کرتے ہیں ان کی طرف سے زیادتی بھی ہو تو غصے کو دبا لیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے بعد یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم تو بڑا احسان کر رہے ہیں۔

آدمی کے لیے بڑا امتحان ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کے لیے انفاق کرتا ہے خرچ کرتا ہے اور دوسرے کی طرف سے بڑا ہی غلط رویہ سامنے آجاتا ہے۔ تو فرمایا اس موقع پر بھی اپنے غصے کو دبا لیتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، یہی خوب کار ہیں، یہی اچھا رویہ اختیار کرنے والے ہیں اور اللہ ان خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ یہ اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشتا ہے؟[۲]

(سورۂ آل عمران آیت ۱۳۴ کے درس قرآن سے ماخوذ اقتباس)

اچھی صحبت کی اہمیت اور شیطان کی چالوں سے بچاؤ

سوال: جلد اچھی صحبت تلاش کر لیں، ورنہ شیطان کی چالوں سے بچنا آسان نہیں!!

جواب: اللہ کے پیغمبر کا بتایا ہوا سلوک یہی ہے کہ نماز، مسجد اور قرآن ان کے ساتھ سچا اور محکم تعلق قائم کیا جائے، یہ اللہ کا تقویٰ ہے، یہ اللہ کا ڈر ہے اور یہ پیدا ہی اس سے ہوتا ہے۔

لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آدمی ہر وقت نماز ہی پڑھتا رہے، مسجد سے بھی کبھی دوری ہو جاتی ہے، قرآن مجید کے مطالعے کے لیے بھی لوگ وقت کم ہی نکال پاتے ہیں، اگرچہ بہت اہتمام کرنا چاہیے۔ تو فرمایا کہ ایک دوسری چیز کا اہتمام بھی کرو، وہ ان چیزوں کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بھی بنے گی اور شیطان کی دراندازیوں کے مقابلے میں حصار کا کام بھی دے گی۔ وہ کیا چیز ہے؟ وہ یہ ہے کہ 'كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ' اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

یہ ہے صحبت۔ آپ جن لوگوں کے پاس بیٹھتے ہیں، جن سے آپ کا تعلق ہوتا ہے، اس میں بہت احتیاط کرنی چاہیے، کیونکہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کب بری صحبت نے شیطان کو دراندازی کا موقع دے دیا۔ کم زور تو درکنار بسا اوقات مضبوط آدمی بھی کچھ نہ کچھ ان کا اثر قبول کر ہی لیتا ہے۔ آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ کب اس کے افکار

۲-https://www.facebook.com/share/v/9Xrz2gwXRcLJQsTs/?mibextid=oFDknk

میں، اس کے خیالات میں شیطان داخل ہو گیا اور کب وہ عمل پر بھی اثر انداز ہونے لگ گیا ہے۔

جب آپ کے گرد و پیش میں اچھے لوگ ہوتے ہیں، اٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے تو اس میں انسان کو ایک بڑی قوت حاصل ہو جاتی ہے، یعنی وہ اگر کسی وقت گر جاتا ہے اور اٹھنا چاہتا ہے تو اچھے لوگ اس کے مددگار بن جاتے ہیں، اٹھانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں تو کم زور سے کم زور آدمی کے اندر بھی اپنی کم زوریوں پر غالب آنے کا حوصلہ پیدا ہو جایا کرتا ہے، یعنی وہ اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھتا ہے تو پھر وہ انھی کا سا ہو جاتا ہے۔

شیخ سعدی نے تو ایسی ایسی عمدہ تمثیلوں سے اس کو واضح کیا ہے کہ آدمی اش اش کر اٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی یہی بات فرمائی ہے کہ صحبت صالح ترا صالح کند (نیکوں کی صحبت انسان کو نیک بناتی ہے)۔ یہی اصول ہے۔[۳]

(سورۂ توبہ آیت ۱۱۹ کے درس قرآن سے ماخوذ اقتباس)

۳-https://www.facebook.com/share/v/gpkpNWS5v6ANsZoJ/?mibextid=oFDknk

محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۴)

باب ۱۵

اوصاف اور مزاج

امین احسن ظاہری اور باطنی لحاظ سے بڑی پر کشش شخصیت رکھتے تھے۔ مثبت شخصی اوصاف اور مزاج رکھنے والے انسان کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں، اس کی صحبت کو غنیمت سمجھتے ہیں، اس کی غیر موجودگی میں اسے شدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اس کی صحبت حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ میں نے خود ان کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے والے حضرات سے یہ سنا کہ ان کی صحبت میں بیٹھنے سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ تو ہوتا ہی ہے، مگر طبیعت بھی تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کی نشست میں بیٹھنے سے قبل سر میں اگر کسی قسم کی گرانی ہو تو نشست کے خاتمے تک وہ ختم ہو چکی ہوتی ہے۔

ذیل میں امین احسن کی شخصیت کے اوصاف اور مزاج کا ذکر کیا جاتا ہے:

معمولات

۱۹۲۵ء میں مولانا حمید الدین فراہی کی شاگردی میں آنے کے بعد آخر عمر تک امین احسن کا یہ معمول رہا کہ صبح ۳ بجے بیدار ہوتے، نماز تہجد ادا کرتے اور پھر قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تھے۔ وہ قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر غور کرتے تھے۔ اور پھر دیگر امور انجام دینے کے بعد رات ۹ اور ۱۰ بجے کے درمیان سو جاتے تھے۔

۴؍نومبر ۱۹۸۹ء کو اپنی ہفتہ وار نشست میں گفتگو کرتے ہوئے امین احسن نے بڑھاپے میں اپنے معمولات کی تفصیل کچھ یوں بیان کی:

''اس بڑھاپے میں میرا حال یہ ہے کہ میرے چوبیس گھنٹے مصروف رہتے ہیں۔ میرا کوئی وقت ضائع نہیں جاتا۔ چند گھنٹے سوتا ہوں۔ اس کے بعد اٹھتا ہوں۔ اور اپنے کام کرتا ہوں۔ کام کرنے کے بعد تھک جاتا ہوں۔ اب وہ قوت کار تو باقی نہیں رہی۔ پھر اس کے بعد کچھ دیر تک آرام کرتا ہوں۔ اس کے بعد پھر کام میں لگ جاتا ہوں۔ پھر کچھ دیر آرام کرتا ہوں پھر کام میں لگ جاتا ہوں۔

میرے چوبیس گھنٹے مصروف ہیں۔ کم از کم روز دو اخبار پڑھنا ضروری ہے میرے لیے۔ ایک اردو کا ایک انگریزی کا۔ اس لیے پڑھتا ہوں تاکہ میں اپنے ملک کے حالات سے باخبر رہوں۔ یہ واقف رہنا ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں تھک کے چور ہو جاتا ہوں۔ میں نے اوقات مصروف رکھے اپنے۔ قرآن مجید اور حدیث پر غور کرنے کے لیے کئی کئی گھنٹے صرف کرتا ہوں۔ اور یہ سمجھتا ہوں کہ دین کے کیا کیا مسائل ہیں شریعت کے کہ جن مسائل کے بارے میں لوگوں کے ذہن الجھے ہوئے ہیں۔''

سراپا

امین احسن خوش شکل، خوش ہیئت اور خوش لباس تھے۔ چہرے کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ بسا اوقات بیمار ہو جاتے تو چہرہ دیکھ کر لوگ یقین نہ کرتے تو امین احسن مسکراتے ہوئے کہتے: بھئی، میں واقعی بیمار ہوں۔

ڈاکٹر زاہد منیر عامر اسی پہلو سے لکھتے ہیں:

''یہ ۱۷؍مئی ۱۹۹۰ء کی ایک کم گرم شام تھی۔ مولانا کی رہایش گاہ کا نظر افروز لان اور ڈیفنس کی کشادہ فضا موسم کو خوشگوار بنائے ہوئے تھی۔ مولانا اس وقت عمر کی ۸۶ ویں حد عبور کر چکے تھے لیکن ان کا چہرہ تروتازہ تھا، یادداشت محفوظ، ذہن براق۔ ثقل سماعت کے سوا، یوں لگتا تھا پیری ان سے کچھ نہیں چھین سکی ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۵-۶۶)

لباس

جناب جاوید احمد غامدی نے ایک دفعہ امین احسن کے لباس پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ مولانا مودودی نے ساری زندگی چوڑی دار پاجامہ یا کھلا پاجامہ پہنا اور اپنی وضع داری قائم رکھی، جب کہ امین احسن نے جلد ہی اسے ترک کر دیا تھا اور یہاں کی شلوار قمیص اختیار کر لی تھی۔ ان کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا اور استری شدہ ہوتا تھا۔ ٹوپی

بھی بہت نفیس ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ اپنی ہفتہ وار نشست میں گفتگو کرتے ہوئے امین احسن نے اپنے لباس کے بارے میں بڑے لطیف انداز میں بتایا:

”اگرچہ یہ کچھ پہلے سے ہی ہے۔ کھجلی سی ہوتی ہے۔ جلد پر خشکی بہت بڑھ جاتی ہے۔ کھرنڈ سی پڑ جاتی ہے اس پر۔ میں جب ہاتھ اس پر پھیرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ببول کے درخت کا کوئی تنا ہے۔ اس کے لیے میں صرف ایک کام کرتا ہوں کہ ہفتے میں دو دن نہاتا ہوں۔ اس سے پہلے تیل کی مالش کر لیتا ہوں۔ اس سے کچھ آرام آجاتا ہے۔ انڈا اس کے لیے مضر ہو سکتا ہے۔ وہ میں ایک سے زیادہ کبھی کھاتا نہیں۔ ایک سے زیادہ تو میں جرم سمجھتا ہوں کھانا۔ چائے پیتا ہوں وہ بھی کم۔ ایک پیالی، آدھی پیالی۔ نہانے کے بعد تیل لگا سکتا ہوں۔ ویسے یہ ہے اہتمام ذرا مشکل۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پھر یہ کپڑے اتار کے دوسرے پہننا پڑتے ہیں ورنہ تیل چپڑنے کے بعد مشکل ہو جاتی ہے۔ آج کل بھی تھوڑا سا جو تیل لگا لیتا ہوں تو اس کی وجہ سے رات کو کپڑے بدلنے پڑتے ہیں اور یہ ایک مسئلہ بن جاتا ہے میرے لیے۔ میری زندگی تو ہمیشہ سے طالب علمانہ رہی ہے۔ جو کپڑا پہنا اسی میں سوتا رہا ہوں، اسی میں ملاقات کرتا رہا، اسی میں لیڈری بھی کر لیتا رہا ہوں۔“

قرآن کے ساتھ زندہ تعلق

امین احسن اپنے استاذ مولانا فراہی کا یہ قول سنایا کرتے تھے کہ قرآن کو ہمیشہ اپنی ہدایت کے لیے پڑھو۔ امین احسن کی زندگی اس بات کا بہترین نمونہ تھی۔ قرآن مجید میں ہے کہ مصائب و آلام میں: 'اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'[9] (صبر اور نماز سے مدد چاہو)۔ امین احسن کے سب سے بڑے اور جوان بیٹے ابو صالح کی اچانک موت کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، انھیں جب یہ دردناک خبر ملی تو اپنا سر سجدے میں رکھ دیا۔ اپنے رب سے صبر و استقامت کی دعا کی۔ لوگ تعزیت کے لیے جمع ہونے لگے۔ بڑی کرب ناک صورت حال تھی۔ ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ جب یہ بوجھ ناقابل برداشت ہونے لگتا تو وہ مجلس سے اٹھ جاتے اور نماز پڑھنے لگتے۔ یوں اس ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن کی ہدایت کے مطابق نماز سے خدا کی مدد حاصل کرتے۔ ان کی زندگی کا معمول تھا کہ جب کوئی معاملہ پیش آتا تو اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے فی الفور قرآن کی طرف متوجہ ہو جاتے اور دیکھتے کہ اس صورت حال کے لیے اس کی تعلیم کیا ہے۔ جب وہ اس بات کا تعین کر لیتے تو اس پر پوری طرح عمل کرتے،

۹۔ البقرہ ۲: ۱۵۳۔

خواہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑتی۔

اس سلسلے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''امین احسن کی اقلیم فکر کیا ہے؟ جن لوگوں نے بھی اس کی سیر کے لیے کچھ فرصت پائی ہے، وہ جانتے ہیں کہ مذہبیات کی دنیا میں یہ ایک بالکل نئی اقلیم ہے۔ اس میں ساری حکومت، سارا اقتدار قرآن کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی زبان سے جو لفظ بھی نکلتا ہے، قانون بن جاتا ہے۔ ہر جگہ اس نے ایک میزان نصب کر رکھی ہے۔ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب اپنی اپنی چیزیں لاتے اور اس میزان میں تولتے ہیں۔ پھر جس کی کوئی چیز ذرا بھی وزن میں کم ہو، اس اقلیم میں وہ اسے کہیں بیچ نہیں سکتا۔ علم و دانش، فلسفہ و حکمت، سب قرآن کے حضور میں دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ اس کا ہر لفظ ایک شہر عجائب ہے اور یہ عجائب کبھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ پہلے محکم بولتا اور پھر اس کی تفصیل کر دیتا ہے۔ اس کی باتوں کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آجائے تو خود اسی کی دوسری باتیں وضاحت کر دیتی ہیں۔ اس کا ایک ایوانِ خاص ہے جس کے بام و در پر ہر جگہ جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے کہ جو ہماری باتوں میں نظم و ترتیب کو نہیں مانتا، وہ ہمارے اس ایوان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ امین احسن کی ساری زندگی اسی اقلیم میں بسر ہوئی ہے:

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق''

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۲۴)

دور حاضر میں سائنس کی غیر معمولی ترقی نے بڑے بڑے علماے دین کو بھی مرعوب اور مسحور کر دیا ہے۔ وہ سائنس کے ذریعے سے مذہبی حقائق کو ثابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بلکہ بعض تو اس قدر شدید احساس کم تری میں مبتلا ہوئے کہ مذہب کو سائنسی نظریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش بھی کر ڈالی، مگر امین احسن اس معاملے میں بھی سب سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''امین احسن نے یہ تفسیر قرآن پر ایمان کی جس کیفیت میں لکھی ہے، اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یاد ہے، وہ سورۂ رحمٰن کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ 'يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ' کے تحت جب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ عام خیال کے مطابق موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں، لیکن قرآن بالکل صریح ہے کہ یہ دونوں ہی پانیوں سے نکلتے ہیں، تو انھوں نے مجھے تحقیق کے لیے کہا۔ میں نے دیکھا، ان کے چہرے پر تردد کی کوئی پرچھائیں نہ تھی، بلکہ ایک عجیب اطمینان تھا اور ایمان کی ایک عجیب روشنی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے جو کچھ کہا

میں اسے بعینہٖ تو شاید دہرا نہ سکوں، لیکن مدعا یہی تھا کہ خدا کی قسم، اگر موتی خود آکر بھی مجھے کہیں کہ وہ صرف کھاری پانی ہی سے نکلتے ہیں تو میں ان سے کہہ دوں گا: تمھیں اپنی تخلیق میں شبہ ہوا ہے۔ قرآن کا بیان کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔'' (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۱۴)

ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے امین احسن کا انٹرویو کیا۔ ذیل میں چند سوال و جواب پیش کیے جاتے ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امین احسن کا قرآن کے ساتھ کیا تعلق تھا۔

''آپ کے افسانۂ حیات کا مرکزی خیال کیا ہے؟

میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے متعلق میری کیا رائے ہے۔ میرا افسانۂ حیات کوئی نہیں۔ میں صرف سیدھا سادا مسلمان آدمی ہوں اور میرا نقطۂ نظر خالص قرآن رہا ہے۔ قرآن کو سمجھنا، سمجھانا۔ اور یہ بات بھی ہے کہ اس کے لیے طریقہ بھی مولانا فراہی کا جو ہندوستان کے ایک بڑے فاضل پروفیسر گزرے ہیں۔ (مولانا نے پروفیسر کا لفظ غالباً میرے شعبے کی رعایت سے استعمال کیا)۔ ان کے طریقے پر قرآن کریم پر غور کرنا میرا کام رہا ہے، میں نے زندگی بھر یہی کام کیا ہے اور انھی اصولوں کے مطابق تفسیر ''تدبر قرآن'' لکھی ہے، میں نے اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا کا جو طریقۂ فکر ہے وہی نیچرل ہے۔

میرے اس سوال پر کہ آپ کو زندگی کیسی لگی، مولانا نے فرمایا:

میری اپنی زندگی کچھ نہیں ہے۔ میری اپنی زندگی تابع ہے قرآن کے، یعنی میری زندگی میں بامقصد نصب العین جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ قرآن کے مطابق عقلی، اخلاقی، سیاسی، اجتماعی (پہلوؤں سے) زندگی گزاری جائے، میں ہر چیز اجتماعی، سیاسی، اخلاقی، عقلی میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ اس کی پیروی کروں۔

آپ نے اپنی جوانی اور بڑھاپے کی زندگی میں کیا فرق محسوس کیا؟

میری جوانی کی زندگی کہہ لیجیے اور اب بڑھاپے کی زندگی ایک ہی طرح کی ہیں، میرا فکر ہے قرآن، قرآن کے فکر کے مطابق میری اجتماعی، اخلاقی، اصلاحی، سیاسی زندگی ہے۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ زمانے نے آپ کو سمجھ لیا؟

میرا اپنا زندگی میں کوئی خاص اسلوب، کوئی خاص فلسفہ نہیں، اگر میری زندگی کا کوئی فلسفہ ہے تو وہ قرآن ہے۔ اگر کوئی قرآن کو سمجھتا ہے تو اس کے لیے آسان ہے کہ وہ میری زندگی کو بھی سمجھ سکتا ہے، اور اب (اس سلسلہ میں زیادہ) بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بتانے کی کتاب تو میں نے لکھ دی ہے... تدبر قرآن... اس کا مقصد یہی ہے کہ لوگ قرآن کو سمجھ جائیں اور ممکن ہے (اس طرح) مجھے بھی سمجھ جائیں۔

مولانا، آپ زمانے سے جو کچھ کہنا چاہتے تھے، آپ کا کیا خیال ہے، آپ نے وہ سب کچھ کہا، آپ کا پیغام

زمانے تک پہنچ گیا؟

میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں نقطۂ نظر مختلف ہو سکتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کے خیالات کے حدود کو صحیح طریقے پر ہر شخص متعین نہیں کر سکتا۔ یہ واقعی ہے کہ قرآن سے میرا جو تعلق ہے اس کا عملی اطلاق میری اپنی زندگی پر ہوتا تھا، (میرے لیے ضروری تھا کہ) میں اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالوں اور باقی رہ گیا دوسروں کے لیے کوشش کرنا تو یہ (بھی) میرا کام ہے۔ لیکن میں اس کے متعلق تو فیصلہ نہیں کر سکتا کہ (اس میں مجھے) کتنی کامیابی رہی۔

مولانا کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟

میں ذاتی طور پر بالکل مطمئن ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جو نقطۂ نظر رکھتا ہوں یہی ہے کہ لوگوں تک اپنے خیالات وافکار کو پہنچا دینا میرا کام ہے۔ (لوگوں کے) افکار کو تبدیل کرنا میرا کام نہیں ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ جہاں تک میری زندگی کا تعلق ہے میں ایک دفعہ بھی اس (قرآن) سے الگ نہیں رہ سکا۔ اور میں نے (زندگی بھر) یہی کیا ہے کہ قرآن ہر شخص کو پہنچاؤں۔ قرآن کیا چاہتا ہے۔ اس کا نصب العین کیا ہے، اجتماعی (اور) سیاسی زندگی میں (اس کی) کیوں ضرورت ہے تو (یہ سب) بتایا ہے (یہ باتیں) میں سب کو بتاتا ہوں، شاگردوں کو بھی اور جو میرے افکار کو پڑھتے ہیں ان کو بھی (اسی مقصد کے لیے میں نے) درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔

اس لیے میرا کام تو بالکل ٹھیک ہو رہا ہے۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ میرا کام صرف بتانے کی کوشش کرنا ہے۔ آپ کو پڑھا دینا میرا کام نہیں ہے۔ بتا دینا میرا کام ہے۔ یہی کر سکتا ہوں۔

لوگ زندگی کے متعلق (دنیوی حوالوں سے) بہت بڑا نصب العین قائم کر لیتے ہیں، تو پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ میں اپنی زندگی کا (یہ) نصب العین رکھتا ہوں کہ پہنچا دو کہ صحیح بات کیا ہے؟ اس سے میں نے قرآن کو سمجھا اور سمجھانے کی کوشش کی، زندگی بھر پڑھاتا رہا ہوں، تفسیر لکھی ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لیے نجانے کتنی کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ شاید آپ نے دیکھا ہو یہ کتابیں انھی موضوعات پر ہیں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ کتابیں پھیل رہی ہیں۔ تفسیر بھی پھیل رہی ہے۔

کوئی ایسی بات، کوئی ایسا کام جسے انجام دینا آپ کی خواہش رہی ہو، لیکن وہ انجام پذیر نہ ہو سکا ہو؟

مجھے یہ افسوس نہیں ہے کہ کوئی ایسا پہلو جس میں مزید کام کرنا چاہیے تھا (رہ گیا)۔ میں نے، اللہ کا شکر ہے کہ اپنے استاد کی رہنمائی میں پہلے زندگی کا نصب العین جانا اور پھر اس پر زندگی بھر قائم رہا۔ اور یہ بات بھی ہے کہ وہ ایسا نصب العین تھا جس نصب العین میں ریا کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں (الحمد للہ) اپنے دائرے میں بالکل صحیح

اور موثر ہوں۔"(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۸-۷۰)

فلسفہ اور قرآن

امین احسن ابتدا میں فلسفہ کی طرف بڑی رغبت رکھتے تھے، مگر قرآن مجید نے ان کی رغبت بالکل بدل کر رکھ دی۔ عبدالرزاق صاحب اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

> "۲۸ جنوری ۱۹۹۴: آج مولانا کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ روانی کے ساتھ گفتگو کی۔ مختلف سوالوں کے جوابات بھی دیے۔ مولانا نے فرمایا کہ انھیں نوجوانی میں فلسفہ سے خاص لگاؤ رہا۔ وہ مختلف فلسفیوں کی کتابوں کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن حکیم کا فہم ہونے کے بعد انھوں نے فلسفہ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان فلسفیوں کے نام تک بھول گئے جن کی کتابیں وہ بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔"(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۷)

[باقی]

Monthly
ISHRAQ
Lahore

November 2024
Vol.36 No.11
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ’’اشراق‘‘ کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ’’اشراق‘‘ کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ’’اشراق‘‘ کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ’’اشراق‘‘ کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق